BILKIS A LOTIA
FRERE ROAD PHONE 30…

شکاری

ناول

اِنسانی کردار کی ایک نفسیاتی تحلیل

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
…AR COLONY, KARACHI

از:-

رئیس احمد جعفری

طبع اوّل

جملہ حقوق طبع و اشاعت بحق،
تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور محفوظ ہیں

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI

...ینت اللہ پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور سے چھپوا کر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور سے شائع کیا

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

عنوانات

عنوانات!

پیش لفظ .... شیخ عنایت اللہ ۴
شرح خود .... رئیس احمد جعفری ۷

۱	جشن مسند نشینی	۹
۲	سفر یورپ	۱۸
۳	سیر لندن	۲۹
۴	پرجا منڈل کی شورش	۴۱
۵	بمبئی میں رنگ رلیاں	۶۴
۶	سینما ہاؤس میں	۷۸
۷	مہاراجہ کالج فار گرلز	۹۱

نذرِ عقیدت	۱۰۴
چمپا	۱۱۷
انتقام	۱۳۴
پرائیویٹ سکریٹری	۱۴۵
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا	۱۶۵
دلچسپ سزا	۱۷۵
مہاپاپ	۱۸۶
ملکہ قلوپطرہ	۲۰۵
نگاہِ یار	۲۲۴
نئی شادی	۲۳۵
راجکماری شیلا	۲۴۹
بہارستان	۲۶۵
اندھیر	۲۷۵
عورت کا انتقام	۲۹۰

RAJA ... Tannery Road, BIHAR COLONY, KARACHI.

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

GLORIOUS LIBRARY
1606, Bihar Colony,
KARACHI

پیش لفظ

ملک کے مشہور ادیب اور انشا پرداز مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سے جعفری صاحب کا ذکرِ خیر، ایک ملاقات کے دوران میں کافی دیر تک رہا تھا۔ میں نے جعفری صاحب کی مشہور کتاب سیرت محمد علی کا مطالعہ کیا تھا، بعض دوسری کتابیں بھی اُن کی میری نظر سے گذری تھیں، لیکن یہ سب غائبانہ تھا۔!

گذشتہ ماہ ایک اتفاق کے سلسلہ میں جعفری صاحب کی اور میری خط کتابت شروع ہوئی، اور اس کا خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا ایک معرکہ آرا ناول انسانی کردار کی واقعی نہایت کامیاب تشکیل ہے۔ تاج کمپنی کی طرف سے پیش کیا جارہا ہے۔ مجھے یقین ہے اس ادبی شاہکار کی قدر افزائی کی جائیگی۔

اس ناول کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف اس کا اندازِ بیانی اور اسلوبِ نگارش ہے جو انفرادیت کی پوری شان کے ساتھ پڑھنے والے کو ادب و انشا کی جنّت میں پہنچا دیتا ہے، دوسری طرف انسانی کردار کا وہ پہلو ہے جو ہماری سماج کا غیر منفک جزو بنا ہوا ہے، دنیا آگے بڑھ

چکی ہے، ہر روز جب سورج نکلتا ہے، وہ ارتقا کا ایک نیا پیام لے کر
نمودار ہوتا ہے، لیکن ہماری دُنیا ہمارے دیس کی دنیا اب تک وہی ہے
جو آج سے صدیوں پہلے تھی،

غُربا میں احساس پیدا ہو رہا ہے، متوسط طبقہ میں بیداری پیدا ہو رہی ہے
لیکن اُمرا کا ایک طبقہ ہے جو اب تک اپنی جگہ پر قائم ہے، نہ خود زمانہ کے
ساتھ چلتا ہے، نہ زمانہ کو اپنے ساتھ چلا سکتا ہے، ایسے ہی طبقہ کی ایک
خیالی تصویر آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے، جو رنگین بھی ہے اور سبق آموز
بھی!

شیخ عنایت اللہ

مینیجنگ ڈائرکٹر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور

RAJA LIBRARY
Tannery Road
COLONY, KARACHI

شرحِ خود

بزرگوں کا قول ہے،

"تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

یہ کتاب نہ نظریہ اضافیت" کی کوئی نئی تشریح ہے، نہ فلسفۂ حیات کا کوئی جدید نظریہ، اسلئے تشریح و تفسیر کا توسوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہ تو مشاہداتِ حیات کی ایک جھلک ہے جو شرح و توضیح سے قطعاً مستغنی ہے!

"شکاری کا ہیرو، ہماری آپ کی طرح ایک آدمی ہے، غلط ماحول، ناقص تربیت، فراوانیٔ زر اور احساس و تجربہ کے عدم توازن نے اُسے آدمی سے شکاری بنادیا، اور شکاری بھی، چرند پرند کا نہیں، حیوانِ ناطق یعنی انسان کا دولت اور پھر مطلق العنانی کی مسند پر پہنچکر ہر شخص مہاراجہ سورج پور بن سکتا ہے، امیر اگر بخت و اتفاق سے غریب بن جاتا ہے تو اُسے امیروں سے نفرت ہو جاتی ہے، اور غریبوں کی ہمدردی اس کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے، غریب جب غربت کے بوریے سے امارت کی زرکار مسند پر پہنچتا ہے

تو وہ غریبوں کو بھول جاتا ہے، اُن سے ذرا بھی ہمدردی نہیں ہوتی ہے، وہ امیروں ہی میں گھل ملجاتا ہے، انسانی فطرت ہی کچھ ایسی ہے، اور فطرت کا بدلنا آسان نہیں،

یہ کتاب کسی کی سوانح عمری نہیں ہے اسمیں آپ کو وہ ربط و تسلسل بھی نہیں نظر آئے گا، جو ناول کے ایک باب کو دوسرے باب سے مربوط رکھتا ہے۔ یہ تو ایک غیر متوازن زندگی کا "فرضی" اسکیچ ہے، یہ مصور کی کھینچی ہوئی تصویر نہیں ہے، نقاش کے چند نقوش ہیں، اسے اگر آپ انسانی کردار کا ایک ڈرامہ فرض کریں تو یوں سمجھئے کہ "کیرکٹر ایکٹر" مہاراجہ سورج پور ہیں باقی کردار ضمنی ہیں اور "سائڈ کیرکٹر" کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ فسانہ یا ڈرامہ کا وہ لازمی جزو ہو، یہی وجہ ہے کہ دوسرے کردار اتنے نمایاں نہیں جتنے مہاراجہ نمایاں ہیں، ہونا بھی یہی چاہیئے، آفتاب کی روشنی میں چاند اور چاند کی چاندنی میں تارے کب اپنی جھلک دکھا سکتے ہیں؟

یہ کتاب اگر آپ کو پسند آئے تو تعریف و ستائش کے مستحق شیخ عنایت اللہ صاحب ہیں، جنہوں نے ایک مصنف کی حوصلہ افزائی کی، اور اگر ناپسند ہو، تو ہر عتاب کا مستحق میں ہوں کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا،

رئیس احمد جعفری بمبئی

۱۹ مئی سنہ ۱۹۴۴ء

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI

باب
(۱)
جشنِ مسند نشینی!

آج ہز ہائینس مہاراجہ صاحب سورج پور کا جشن مسند نشینی تھا۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے ملک کے والیان ریاست کی ایک بڑی تعداد جلوہ فگن تھی، رزیڈنٹ صاحب بہادر بھی موجود تھے۔ ملک کے بہت سے لیڈر بھی مدعو تھے ریاست کے حکام و عمال بھی زرق برق لباسوں میں

اپنی مستعدی و سرگرمی اور وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ سارا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ سڑکوں کی از سرِ نو مرمت کی گئی تھی۔ جو مکانات لبِ سڑک واقع تھے ان پر ریاست کے حکم سے مالکوں کی طرف سے سفیدی کرائی گئی تھی۔ موٹروں کی قطاریں زناٹے سے اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں یہ فلاں راجہ صاحب کی سواری ہے۔ اس موٹر پر وہ مہاراجہ صاحب جا رہے ہیں۔ اس چوکڑی پر نواب صاحب بہادر مع اپنے اسٹاف کے سیر کے لئے نکلے ہیں خلقت کے شوق تماشا کا یہ عالم تھا کہ جسے دیکھئے دیوانہ وار آج کے جلوس اور جلسہ اور دربار کی گھماگھمی دیکھنے کے لئے بلا پڑتا تھا۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا جشن واقعی ایک بے نظیر جشن تھا۔

جاذبیت اور تفریح کا کوئی سامان ایسا نہیں تھا۔ جس کا انتظام نہ کیا گیا ہو، رنڈیوں کے طائفے، گانے والیوں کے پرے، ناچنے والیوں کے جمگھٹے، قدم قدم پر دل لبھاتے تھے۔

سب سے پہلے رسمِ مسند نشینی ادا کی گئی ریزیڈنٹ صاحب نے ایک شستہ اور برجستہ تقریر کرتے ہوئے لبِ لعلیں سے ارشاد فرمایا۔

"یور ہائنس!

مجھے امید ہے اپنے قابلِ فخر اجداد کے نقشِ قدم پر چل کر، آپ اپنی

ریاست کا نام بلند کریں گے، اپنے کارناموں سے گذشتہ تاریخ کو ماند کر دیں گے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں، جہاں دیدہ ہیں کار آزمودہ ہیں، آپ سے میری بہترین توقعات وابستہ ہیں آپ نے کیمبرج میں تعلیم حاصل کی ہے، آپ نے بلاد مغرب کی سیاحت کی ہے اور تجارب حاصل کئے ہیں، آپ نے آنجہانی مہاراجہ کے عہد میں حکومت کے مختلف شعبوں کے انتظامات کی نگرانی کی ہے۔ آپ سے بڑھ کر زمانہ کے جدید رجحانات کے مطابق، کون ہے جو ریاست کا بندوبست کر سکے ؟ (چیرز)

رزیڈنٹ صاحب کے بعد مہاراجہ نے گل افشانی کی، خاتمہ کلام پر آپ نے ارشاد فرمایا:-

"میرے متعلق جن خوشگوار توقعات کا اظہار کیا گیا ہے، میری دعا ہے کہ میں اُن کا اہل ثابت ہوں، میں اپنے تئیں اس ریاست کا حاکم نہیں سمجھتا میں تو اپنی رعایا کا خادم ہوں، میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھوں گا۔ اگر مجھ سے کوئی خدمت بن آئی۔

زمانہ کے جدید رجحانات سے میں ناواقف نہیں ہوں، مجھے معلوم ہے آج دُنیا کدھر جا رہی ہے۔ میں جانتا ہوں آج خیالات میں کس درجہ انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔ میری آنکھوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ کہ اب رعایا صرف مجہول اطاعت نہیں پسند کرتی، بلکہ وہ حکومت کے نظم و انصرام

میں حصّہ چاہتی ہے، عمل دخل چاہتی ہے شرکت چاہتی ہے، اِن
خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اعلان کرتا ہوں کہ بہت جلد میری ر
میں ایک ذمہ دار اور نمائندہ اور با اختیار مجلس قانون ساز کا قیام عمل
لایا جائے گا (نعرہ ہائے مسرت پرزور تالیاں "مہاراجہ زندہ باد کی فلک
شگاف صدائیں)

کوئی پندرہ منٹ تک ہال مسرت سے گونجتا رہا - مہاراجہ کا رویہ
ایک طلسم تھا جس نے جاہل اور خواندہ، باغی اور ٹوڈی سب کو رام کر لیا،
ہر شخص کی نظر میں مہاراجہ صاحب دیوتا تھے، اوتار تھے، اس سے بھی
زیادہ تھے - اس لئے کہ وہ رعایا کو اپنا غلام بنانا نہیں چاہتے تھے، ب
اسے اختیارات حکومت میں شریک کرنے پر آمادہ تھے!

تقریروں کے بعد جام صحت کا تبادلہ ہوا - قصائد پڑھے گ
اور مہاراجہ صاحب کی شجاعت و شہامت، اور جود و عطا کے ایسے ای
قصّے بیان کئے گئے کہ ارجن اور بھیم کرشن اور رام - حاتم اور نوشیرو
کی روحیں بھی شرما گئی ہوں گی -

اس کے بعد جشن کا سلسلہ شروع ہوا - رقص و سرود کا آغاز ک
گیا، کئی طائفے آئے جنہوں نے اپنے کمالات دکھائے کسی نے گا
میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا اور کسی نے ناچنے میں - آج کا دن مسرت

ان تھا جو سامنے آگیا وہ مالا مال واپس گیا - مہاراجہ دونوں ہاتھوں سے
زر و گوہر اچھال رہے تھے - آج مغنیوں اور رقاصاؤں کی بن آئی تھی - منہ
مانگے دام مل رہے تھے - بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ بہت زیادہ!

آخر میں مس رابعہ اور مس رادھا کی باری آئی - رابعہ کی موسیقی اور
رادھا کے رقص نے سماں باندھ دیا یہ دونوں لڑکیاں شہر کے متمول اور اعلیٰ
خاندانوں کی نورِ نظر تھیں - رابعہ کے والد کرنل ظفر جاوید، مہاراجہ صاحب
کے معتمد خاص تھے اور رادھا کے پدر بزرگوار مسٹر موہن لال عدالت العالیہ
کے جج تھے -

مہاراجہ صاحب ان کا بہت احترام کرتے تھے - گرل کالج میں دونوں
تعلیم حاصل کر رہی تھیں - رابعہ ایف - اے میں رادھا بی - اے، میں کالج میں
اکثر ڈرامے ہوتے رہتے تھے سوانگ رچائے جاتے تھے - ناٹک کھیلے
جاتے تھے - تعلیم چونکہ مخلوط تھی - اس لئے ہیرو اور ہیروئن اور ویلن اور
ایمپرس اسٹار اور ایکٹریس بننے بنانے میں کچھ دیر نہ لگتی تھی - رابعہ
کی موسیقی اور رادھا کے رقص کی سارے کالج میں دھوم تھی - کالج میں
نہیں شہر بھر میں غلغلہ تھا - آج اس جشن طرب کے موقع پر مس ہارڈی نے
جو کالج کی پرنسپل تھیں مناسب سمجھا کہ کالج کی طرف سے بھی اس میں
حصہ لیا جائے -

جب ایکٹرسیں اور طوائفیں جن کے قافلے، دہلی، لکھنؤ، بمبئی اور کلکتہ سے آئے تھے، اپنے کمالات دکھا چکیں، تو مس رابعہ اسٹیج پر، مہرِ منیر بنکر جلوہ فرما ہوئیں، آتے ہی غالب کی مشہور غزل سے

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیئے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

کچھ ایسے لحن اور طرز سے چھڑی کہ ناہید فلک کو بھی پسینہ آگیا ہوگا۔ پھر مس رادھا کی باری آئی، لوگ سنبھل بیٹھے کہ اب قیامت آیا چاہتی ہے وہ آئی، ——— اور آتے ہی اُس نے قتل عام شروع کر دیا۔ اس نے رقص شروع کیا، اور یہ معلوم ہوا کہ درو دیوار، زمین و آسمان، شجر و حجر رقص کر رہے ہیں۔ اُس کے پاؤں کی ہر دھمک، گھونگھرو کی ہر آواز، ہاتھوں کی ہر حرکت، کمر کی ہر لچک، اور گردن کی ہر جنبش، ایک مستقل فن تھی۔

اس کا خرام ناز دلوں کو پامال کر رہا تھا۔ اس کا آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا، اسٹیج پر دبے پاؤں چلنا۔ چلتے چلتے دفعتہً ٹھوکر لینا، پاؤں کا دھمکنا برق جہندہ کی طرح ہر ہر گوشہ میں پہنچنا، اور نسیم سحر کی طرح اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے بازگشت کرنا، ایک ایسا فن تھا جس کے لئے ابھی تک کوئی اصلاح وضع نہیں ہوئی ——— دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر جب وہ کمر کو بل دیتی

تو یہ معلوم ہوتا کہ کوئی ناگن لہرا رہی ہے - جب وہ اپنی گردن کو جنبش دیتی اور دیتی رہتی، تو ایسا معلوم ہوتا کمہار کے چاک پہ سے نرشی ترشائی صراحی اب اترا ہی چاہتی ہے، جب وہ جھومتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی مسکراتی ہوئی اپنے محور پر خراماں ہوتی، تو معلوم ہوتا، کوئی پری آب رواں کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہے، جب وہ جھکتی اور جھک کر اٹھتی، تو محسوس ہوتا

ع— اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز ہے حسن!

کوئی آسمانی مخلوق ہے جو زمین کی پستیوں سے عرش بریں کی بلندیوں پر اڑی چلی آ رہی ہے - رقص کرتے کرتے اس نے کنوئیں سے ڈول کھینچنے کا منظر دکھایا، دیکھنے والے دہل اٹھے - کہیں زمین کی تہ سے پانی کا ہر قطرہ کھنچ کر نہ چلا آئے، ناچتے ناچتے اس نے پتنگ اڑانے کا سماں کھینچا، ڈھیل دے کر جب اس نے ڈور کھینچی ..... پنجوں کے بل کھڑے ہو کر، آنکھیں اوپر اٹھا کر، بجلی کی سی تیزی پیدا کر کے ...... جب اس نے ڈور کھینچی تو دیکھنے والے یہ سمجھے کہ آسمان بندھا ہوا چلا آ رہا ہے-

وہ اپنے مختصر سے محور پر اس طرح جست و خیز کر رہی تھی، جیسے ہرن وسیع میدان میں چوکڑیاں بھرتا ہے۔

وہ اپنے نازک بدن کو ہچکولے دیتی تھی، ...... جیسے، گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہو اور سوار رکاب میں پاؤں جمائے، اس کی گردن پر

ہچکولے پر ہچکولے کھا رہا ہو۔ رادھا کا رقص ختم ہوا، لیکن لوگوں کی محویت نہ ختم ہوئی از خود رفتگی برابر قائم رہی، ایسا معلوم ہوتا تھا، حاضرین پر کسی نے جادو کر دیا ہے، یہ انسان نہیں مٹی کے پتلے ہیں۔ جن میں حس و حرکت نہیں

خود مہاراجہ صاحب کی محویت کا یہ عالم تھا کہ ٹکٹکی لگائے رادھا کو دیکھ رہے تھے، ان کا بس چلتا تو شاید اسے اپنے دل میں بٹھا لیتے۔ نظروں کی بیتابی یہی کہہ رہی تھی۔ بیتابی کی بے ساختگی سے یہی ٹپک رہا تھا۔ مہاراجہ صاحب کی تقریر دلپذیر اور رزیڈنٹ صاحب کے ارشادات عالیہ پر بھی اتنے چیرز نہیں دیئے گئے، جتنے رادھا نے اپنے رقص بے محابا سے حاصل کر لئے، ہال کی چھت معلوم ہوتا تھا کہ اڑی جا رہی ہے۔ رادھا نے اپنا یہ قبول عام دیکھا، مسکراتی، لجاتی آئی۔ اور خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ آج وہ فتحمند تھی! فتحمندی کا غرور، اس کے چہرۂ گل رنگ پر غازہ کا کام کر رہا تھا۔

تقریباً تین بجے رات کو یہ مجلس طرب ختم ہوئی مہاراجہ صاحب! ایوان شاہی میں داخل ہوئے۔ اور حاضرین مجلس اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف روانہ ہوئے۔

لوگوں کے ذہن و دماغ پر دو ہی خیال چھائے ہوئے تھے۔ رادھا کا رقص

اور مہاراجہ صاحب بہادر کی آزاد خیالی، عالی ہمتی ، تدبر اور دُور اندیشی!
بہت سے لوگوں کو یقین کامل تھا۔ سورج پور کو سوراج مل گیا۔ ظلم اور
مطلق العنانی کا دَور ختم ہوا، آزادی کا سورج چمکا! اب تک رعایا غلامی
کے بوجھ سے دبی ہوئی تھی اَب وہ آزادی کا سانس لے گی اُسکھ سے
زندگی بسر کرے گی، اَور امورِ سلطنت میں حصہ لے گی – اس اُمید کو اس خیال سے
تقویت ہوتی تھی کہ مہاراجہ صاحب خاندانی مہاراجہ نہیں تھے۔ خاندانی
مہاراجہ ہوتے تو اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتے اَور محلوں میں پلنے والوں
کے اندر جو ضد، ہٹ، خود ستائی، استبداد پسندی ہوتی ہے، وہ
ان میں بھی ہوتی، لیکن چونکہ آج سے چار برس پہلے تک یہ خود بھی غریب تھے،
ایک گاؤں میں رہتے تھے اور روز پیدل جاکر، شہر میں تعلیم حاصل کرتے تھے اس
لئے اُمید تھی کہ راج پاٹ کے مالک ہونے کے بعد اپنے غریب ساتھیوں کا
خیال کریں گے، دُوسروں کا درد و دُکھ سمجھیں گے، غریبوں اور محتاجوں کے
کام آئیں گے۔ اگر اُنہیں آنجہانی مہاراجہ صاحب نے متبنیٰ نہ کر لیا ہوتا۔ تو آج
یہ جوتیاں چٹخاتے پھرتے، کوئی بات بھی نہ پُوچھتا۔ قسمت زوروں پر تھی ستارہ
لڑ گیا۔ مہاراجہ صاحب کی نظرِ عنایت نے انہیں فرش پر سے عرش پر پہنچا
دیا، اپنا بنا لیا، اور آج خدا نے یہ دن دکھایا کہ سورج پور کی پوری
حکومت ان کے ہاتھ میں آگئی ۞

LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب
(۲)

سفر یورپ

مہاراجہ صاحب نے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، مجلس قانون ساز کی تیاریاں شروع ہوئیں اور کچھ عرصہ کے بعد "سورج پور لیجسلیٹو اسمبلی" کا افتتاح مہاراجہ صاحب بہادر نے اپنے دست مبارک سے فرمایا۔

افتتاح کے چند ہفتوں کے بعد مہاراجہ صاحب کے دل میں سفر یورپ کا

خیال آیا انتظامات شروع ہوئے اور دو ہی دن کے بعد ہز ہائینس مع اسٹاف کے اسپیشل ٹرین پر بمبئے روانہ ہوئے۔ اس اسٹاف میں مس رادھا بھی تھیں، ہز ہائینس اُن پر بہت مہربانی فرماتے تھے، اب وہ بی اے کے امتحان میں کامیاب ہو چکی تھیں،

مہاراجہ کا خیال تھا کہ انہیں اپنے ساتھ لے جا کر یورپ کی سیر کرا دیں، اور اگر مناسب ہو تو وہاں کسی یونیورسٹی میں اعلےٰ تعلیم کے لئے داخل بھی کرا دیں، رادھا کی تو یہ دلی آرزو تھی جسٹس موہن لال بھی اس آرزو میں مخل ہونا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ طے ہو گیا، وہ مہاراجہ صاحب کے ساتھ یورپ جائیں۔

بمبئی میں ارادہ تھا کہ ایک ہفتہ ٹھہریں، پھر ولایت روانہ ہوں، یہ ایک ہفتہ اس طرح گذر گیا، جس طرح چند گھنٹے گذرتے ہیں سیر، تفریح، سینما تماشہ، ناچ گھر، ہوٹل، ڈنر، بس یہ مشاغل تھے، مشاغل زیادہ تھے اور وقت کم تھا۔ اس لئے "باقی آئندہ" کہہ کر مہاراجہ صاحب نے اپنے اسٹاف کے جہاز پر قدم رنجہ ہوئے!

جہاز کیا تھا، ایک مختصر سی دُنیا، دُنیا حسن و جمال کی! عشوہ و ناز کی! رنگ و بو کی! کیف و سرور کی! عیش و نشاط کی! خدمت کرنے والے چھوکرے اور چھوکریاں جن پر حور و غلمان کا دھوکا ہوتا تھا دل بہلانے

والی" سوسائٹی گرلس" جو ہر آن تقویٰ شکنی پر مائل! آزادانہ اور بے باکانہ رسم وراہ پیدا کرنے والی خاندانی خواتین جن سے پہروں گفتگو کیجئے، اور طبیعت سیر نہ ہو علاوہ ازیں اور بہت سی نئی دلچسپیاں، ورزش کا انتظام غسل کے لئے حوض اور تالاب، ہمت ہو کود جایئے، تیریئے، دوسروں پر پانی پھینکیے اور خود پانی کے چھینٹے نازک اور نرم اور گداز ہاتھوں سے، قہقہوں کے شور مسکراہٹوں کے ہجوم، اور برق پاشیوں کے انبوہ میں — کھایئے اور کھاتے رہیئے، اگر "دست بدست رقص" سے دلچسپی ہو تو اس کا بھی بہتر سے بہتر انتظام موجود، بہترین ہندوستانی اور یورپین حسن شرکت رقص کے لئے آمادہ! اگر راز و نیاز سے طبیعت بہلتی ہو تو اس کا بھی پورا پورا امکان، عرشہ پر ٹہلئے کسی گوشہ میں کرسی ڈال لیجیے اور سرگرم تکلم ہو جایئے! سے

بہشت آنجا کہ از ارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

کا معاملہ ہے آپ کے لطف صحبت میں کوئی بھی مخل نہیں ہوگا "فردوس گوش" موسیقی کے نغمے بھی موجود! غرض دلچسپی کا جو سامان ہو سکتا ہے سب مہیا! سکنڈ کلاس کے کمروں میں ہز ہائینس کا ماتحت عملہ مقیم تھا، فرسٹ کلاس کے متعدد کمروں پر مصاحبوں ندیموں اور خاص الخاص معتمدوں

نے قبضہ جمایا! "کیبن ڈی لکس" میں مہاراجہ صاحب با ہزار شان و تجمل مقیم ہوئے۔

مس رادھا کا قیام، باضابطہ طور پر، تو فرسٹ کلاس کے ایک کمرہ میں تھا، لیکن ان کا اکثر وقت ہز ہائینس صاحب کی معیت میں گزرتا تھا۔ اس لئے "کیبن ڈی لکس" ہی کو وہ بھی اپنی قیام گاہ کے طور پر استعمال کر رہی تھیں!

جہاز پر مہاراجہ صاحب، مہاراجہ نہیں تھے، بلکہ ایک ہنس مکھ، بے تکلف، خلیق، اور دلچسپ مسافر تھے، کہیں اس مجمع میں بیٹھے ہوئے برج کھیل رہے ہیں کبھی اس قافلہ میں بیٹھے ہوئے، داستان سرائی میں حصّہ لے رہے ہیں، کبھی مس ملر سے امریکہ کے واقعات، ہالی وڈ کی کیفیات، شکاگو اور نیو یارک کے مناظر پر گھنٹوں باتیں ہو رہی ہیں کبھی مس ڈگلس سے فلسفہ عشق پر معرکتہ الآرا مباحث ہو رہے ہیں۔ کبھی محبت کے رموز و نکات بیان ہو رہے ہیں۔ اور کبھی مرد کی ہوس پرستی، عورت کی شوہر پرستی، اور دنیا کی سماج پرستی پر لچھے دار تقریر ہو رہی ہے۔ کبھی خود مزے لے لے کر ہندوستان کی توہم پرستی، ہندوستانی عورتوں کی قدامت، ہندوستانی سماج کی ظلم آرائی اور ہندوستانی رقص و نغمہ پر پھبتیاں کس رہے ہیں اور کبھی گوش ہوش سے یورپ کی آزاد روی کے قصّے سن رہے

ہیں - دن اسی طرح رات بنتا تھا، اور رات اسی طرح دن کا لباس پہنتی تھی -

. . . . . . ایک مرتبہ ڈرائنگ روم میں مجلس جمی ہوئی تھی مہاراجہ صاحب راجہ اندر بنے، حوا کی بیٹیوں کے جلو میں بیٹھے ہوئے کیف روح و نظر کا سامان کر رہے تھے، کہ مس ہکر نے پوچھا :-

"کیا اب بھی ہندوستان میں قدامت کا اثر قائم ہے ؟"

"بہت زیادہ" مہاراجہ صاحب نے فرمایا -

"وہاں کی عورتیں سیاسیات میں بالکل حصہ نہیں لیتیں ؟"

"قطعاً نہیں !"

"تو وہ صرف بچہ پیدا کرنے کی مشینیں ہیں ؟"

"وہ بھی نہایت ناقص ؟"

"لیکن تعلیم یافتہ طبقہ تو اب قدامت کے اثر سے آزاد ہو رہا ہوگا ؟"

"کچھ کچھ"

"مسکرا کر تو ابھی کافی عرصہ تک آپ کے ملک کا مستقبل تاریک ہے !"

"اور کیا ؟"

. . . مہاراجہ صاحب نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا، اور سلگایا، اور کش لگاتے ہوئے فرمایا :-

"میرا تو ہندوستان میں بہت کم جی لگتا ہے اسی لئے میں نے

سفرِ یورپ شروع کیا ہے ۔مس بلر، آپ کے امریکہ بھی میرا آنے کا ارادہ ہے !"

"ضرور! مہاراجہ صاحب ضرور!!"

مس ڈگلس بولیں (مہاراجہ صاحب سے مخاطب ہوکر) وہاں آپ کو اندازہ ہوگا ، دُنیا کیا ہے ؛ زندگی کسے کہتے ہیں ؛ معاشرت کس چیز کا نام ہے ؟"

مہاراجہ صاحب نے معنی خیز نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور خاموش ہوگئے ۔

جب باتیں ہوتی ہیں تو گفتگو کا موضوع ہر آن غیر محسوس طور پر بدلتا رہتا ہے ، ابھی موسم پر گفتگو ہو رہی ہے ، نہ معلوم کس طرح حسن و عشق کا چرچا ہونے لگا ۔ اس سلسلہ میں دو چار مثالیں بیان ہوئیں ۔ کہ یک بیک صحتِ عامہ پر گفتگو ہونے لگی ، یہ تکمیل کو پہنچی کہ مجلس پر سیاسیات نے اپنا قبضہ جما لیا ہے ۔ کہاں تو آج کی مجلس میں ہندوستان کی قدامت اور یورپ کے تجدد پر گفتگو ہو رہی تھی ۔ کہاں مسٹر لوک ناتھ . . . .

(مہاراجہ کے لئے ، ڈی اسی نے لندن کے عشرت کدوں ، پیرس کے نشاط خانوں اور رُوم کے تصویر گھروں کا ذکر شروع کر دیا ۔ بات میں بات نکلتی ہے ۔ یہ قصہ جو چھڑا ، تو رات کے دو بج گئے ۔ اور ان حضرات

کے تجربات و مشاہدات کی فہرست پھر بھی ختم نہیں ہوئی ۔مسٹر لوک ناتھ اپنی رنگین بیانی کا سلسلہ پھر شروع کرنے والے ہی تھے کہ رادھا نے کہا،

"کچھ کل کے لئے رہنے دیجئے ،یا سب کچھ آج ہی بیان کر ڈالنے کا ارادہ ہے!"

لوک ناتھ اس بے موقع تنبیہہ سے بہت خفیف ہوئے ،جواب دینا چاہتے تھے کہ مہاراجہ صاحب اُٹھے اُن کے اُٹھتے ہی مجلس بھی سروقد کھڑی ہوگئی ۔مہاراجہ نے چلتے چلتے لوک ناتھ کی طرف دیکھکر فرمایا :-

"بھئی اب سوئیں گے ۔رات بہت آگئی"

یہ کہا اور آگے بڑھ گئے ۔آگے آگے مہاراجہ صاحب ، اور پیچھے پیچھے . . . رادھا چند لمحوں کے بعد ، دونوں قدم بہ قدم ساتھ چل رہے تھے کیبن کے زینہ پر پہنچتے پہنچتے مہاراجہ کا ہاتھ . . . . رادھا کے ہاتھ میں پیوست تھا!

کیبن میں بجلی کی روشنی ہو رہی تھی ۔

مہاراجہ نے فرمایا ،اس وقت یہ تیز روشنی بُری معلوم ہوتی ہے''

فوراً رادھا نے دوسرا سوئچ دبا دیا ،روشنی گُل ہوگئی ،سبز قمقمہ روشن ہوگیا، . . . کیبن پر ایک عجیب رومانی کیفیت طاری تھی ۔رات کا وقت خلقت خاموش ،جہاز کے اکثر مسافر محو خواب خرگوش ،سمندر کی بلند و بالا

موجیں اُٹھ اُٹھ کر جہاز سے ٹکراتی تھیں، اور شور مچاتی ہوئی اپنا سر پھوڑتی ہوئی پھر پانی کے برابر ہو جاتی تھیں۔

RAJA-LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

مہاراجہ نے کہا "

"رادھا!"

"فرمایئے سرکار"

"نیند نہیں آتی"

"تو کسی کتاب کا مطالعہ فرمایئے!"

"یہ کتاب دیکھنے کا وقت ہے؟"

"جیسی مرضی ہو سرکار کی"

"چلو باہر اپنے کیبن کے عرشہ پر بیٹھیں۔"

"چلیئے"

"تمہیں تو نیند آ رہی ہے"

"جی نہیں میں تو ہمیشہ دیر سے سوتی ہوں"

"اچھا تو چلو"

مہاراجہ صاحب کا کیبن جہاز کی سب سے اُونچی اور آخری منزل تھا، یوں سمجھیے بعض عالیشان مکانوں پر کہیں کہیں چھت پر ایک اوسط درجہ کا کمرہ اور برآمدہ بنا دیتے ہیں۔

اسی طرح جہاز کے آخری اور سب سے اونچے گوشہ پر یہ کیبن تھا، کیبن کے سامنے ایک مختصر سا صحن تھا جسے عرشہ کہہ لیجئے یہاں کبھی کبھی مہاراجہ صاحب آرام کرسی پر جلوہ فرما ہو کر لطف تنہائی اٹھاتے تھے۔ یا موجوں کی شوریدہ سری سے محظوظ ہوتے تھے۔

عرشہ پر غضب کی سرد ہوا چل رہی تھی، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، جہاز پانی کی موجوں کو روندتا، کچلتا، پامال کرتا اور چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا یہ ایک ایسا منظر تھا جو بھیانک بھی تھا اور دلفریب بھی، بھیانک اس لئے کہ پانی کی اس وسیع ترین دنیا پر ایک تنکے کی طرح ... پُرزور اور پُرشور موجوں کا مقابلہ کرتا ہوا، جہاز رواں دواں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑ پر چیونٹی چل رہی ہو، ۔۔۔ دلفریب اس لئے تھا کہ رات بھیگ چکی تھی، چاندنی کھیت کئے ہوئے تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا اڑن کھٹولے پر بیٹھے ہوئے فضا کی وسعتوں کو چیرتے ہوئے بہے چلے جا رہے ہیں۔ منظر کی رومان انگیزی، اس کی ہیبت ناکی پر غالب تھی، مہاراجہ اور رادھا دونوں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے، رادھا خاموش تھی، لیکن اس کا سینہ محشرستان جذبات بنا ہوا تھا۔ مہاراجہ کے لب بھی ساکت تھے، لیکن ہجوم آرزو کی یورش اُن کے چہرہ سے ہویدا تھی۔ رادھا ٹکٹکی لگائے پانی کی موجوں کو دیکھ رہی تھی، مہاراجہ نظر جمائے رادھا کے حسن عالم افروز کا مطالعہ

کر رہے تھے ۔ دونوں کی کرسیاں پاس پاس تھیں شاید دونوں ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سن رہے تھے . . .

. . . چند لمحوں تک سکوت اور سکون کی کارفرمائی جاری رہی ۔ رادھا کا ہاتھ مہاراجہ کے ہاتھ میں تھا ، انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے کہا ،

"را . . . . دھا!"

رادھا خاموش تھی ،

"سنتی ہو رادھا"

رادھا نے آنکھ اوپر اٹھائی اور جھکالی مہاراجہ پھر گویا ہوئے :-

"رادھا ، تم دل کی آواز بھی نہیں سنتیں ؟" جواب کا انتظار کئے بغیر مہاراجہ نے پھر کہا :-

"میرا دل دھڑک رہا ہے ، سینہ میں آرزوؤں کا طوفان برپا ہے ، میں ہوش و حواس کھوتا جاتا ہوں ، تمہیں دیکھکر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں ، تمہیں پاکر میرا کیا حال ہوگا ؟ رادھا بولو بتاؤ!"

"مرد جب عورت کو پالیتا ہے تو خود غرض ہو جاتا ہے ۔ اسمیں رعونت آجاتی ہے ، استبداد پسند ہو جاتا ہے ۔ میں آپ کو نہیں کہتی لیکن اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ، عورت حساس ہوتی ہے ، نازک ہوتی ہے ، صابر ہوتی ہے ۔ وہ

بہت جلد نظروں کو بھانپ لیتی ہے - وہ بہت جلد نڈھال ہو جاتی ہے وہ ہر دکھ برداشت کر لیتی ہے، اسی لئے وہ جذبات کی رو میں بہت بہتی ہے!

"اچھا تو ہماری رادھا تقریر بہت اچھی کر لیتی ہیں اور فلسفیانہ باتیں بھی خوب کرتی ہیں!

(مسکرا کر) "یہ سب حضور ہی کی عنایت ہے!"

"اگر تم نظر بھانپ سکتی ہو، تو میری طرف دیکھو اور بتاؤ، مجھے تم سے سچی اور والہانہ محبت ہے یا نہیں؟"

(مسکرا کر) "میں کیا جانوں؟"

مہاراجہ نے رادھا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گد گدایا اُس نے بے قابو ہو کر کہا "اچھا ہے" اب تو چھوڑیئے!"

"پھر تکلف کیسا؟"

اب رادھا مہاراجہ کے آغوش میں تھی! سمندر کی موجیں جہاز کے تختوں سے ٹکرا رہی تھیں اور عرشہ پر جذبات کی موجیں! عشق اور حسن بن کر تڑپ رہی تھیں، ایک دوسرے سے گتھ رہی تھیں متصادم ہو رہی تھیں، —

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۳)

سیرِ لندن

لندن پہنچنے کے بعد مہاراجہ کی زندگی یکسر کیف و سرور ہو کر رہ گئی - ہائڈ پارک ہوٹل میں مع اپنے عملہ اور اسٹاف کے قیام پذیر ہوئے ان کی تشریف آوری کے ساتھ ہی پریس کے رپورٹروں اور اخبارات کے نمائیندوں اور فوٹو گرافروں کا ایک تانتا بندھ گیا، کوئی بین الاقوامی حالات

پر مہاراجہ کے خیالات معلوم کر لینا چاہتا ہے۔ کوئی ہندوستانی سیاسیات پر ان کے مسلک کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے اخبارات کے فوٹوگرافر مختلف حالتوں میں مہاراجہ کا فوٹو لینے کی کوشش کر رہے ہیں، کسی کو یہ دھن ہے کہ مہاراجہ صاحب گفتگو کے لئے دہن مبارک وا کریں، اسی حالت کا فوٹو لے لیا جائے، کسی کو یہ فکر مہاراجہ صاحب زینہ سے اتر رہے ہوں اس وقت کی تصویر لے لی جائے۔

ٹائمز کے نمائندہ نے پوچھا :-

"آپ کس مقصد سے تشریف لائے ہیں ؟"

"بحالی صحت اور تبدیلی آب و ہوا کے لئے"

"ہندوستان آزادی کے لئے جد و جہد کر رہا ہے ؟

ہم بھی آزاد ہونا چاہتے ہیں — . . لیکن تاج برطانیہ کے ساتھ اپنے معاہدات اور شرائط کے تحفظ کے ساتھ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ ہم پر ہمارے ہموطن حکمرانی کریں "

دوسرے روز بعض اخبارات نے مہاراجہ کی تصویر چھاپی - توڑ مروڑ کر ان کا بیان چھاپا ، اپنی تحقیق کے مطابق اُن کے حالات چھاپے ، ایک اخبار نے لکھا " مہاراجہ سورج پور فرما نروا ہیں - ان کی ریاست میں چاندی اور سونے کی کانیں ہیں ، پشتہا پشت سے چاندی اور سونے

کی سلاخیں پرائیویٹ خزانہ میں جمع ہو رہی ہیں اور اب بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا ہے"

ایک دوسرے اخبار نے لکھا ہے۔

"مہاراجہ ہندوؤں کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنے تئیں سورج کی اولاد کہتا ہے، وہ بڑے خلیق منکسر المزاج اور فیاض طبیعت کے آدمی ہیں۔ مذہبی رسوم کے بہت پابند ہیں۔ پوجا پاٹ کا سلسلہ یہاں بھی جاری ہے۔ "یوگ ورزش" کے بھی مہاراجہ صاحب عادی ہیں۔

لندن آتے ہی مہاراجہ صاحب وہاں کی فضا، آب و ہوا، سوسائٹی اور رنگ میں بالکل گھل مل گئے متعدد سوسائٹیوں کے سرپرست بن گئے کئی کلب تھے جنہیں اپنی ممبری سے نوازا، آرٹ کے چونکہ خاص طور پر قدردان تھے اس لئے فنون لطیفہ سے متعلق انجمنوں اور سوسائیٹوں پر انہوں نے خاص طور پر توجہ شاہانہ مبذول فرمائی کسی کو چندہ دیا، کسی کو بہ مداعانت کوئی بڑی رقم مرحمت فرمادی کسی کے چند خاص مصارف متعین کئے، اور اپنے ذمہ لے لئے۔

انگلستان میں سورج نکلنے کی خوشی اسی طرح منائی جاتی ہے جس طرح مسلمان عید کا چاند دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں، ایک روز خلاف امید دھوپ نکلی ہوئی تھی، موسم بھی خوشگوار تھا، مہاراجہ صاحب ابھی پارلیمنٹ کا اجلاس دیکھ

کر واپس آئے تھے، رادھا ایک صوفے پر خاموش بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ مہاراجہ صاحب نے پوچھا:-

"کس سوچ میں ہو؟"

(متبسم ہوکر) "آپ کو یاد کر رہی تھی۔"

"دیکھو میں بھی، تم نے یاد کیا اور فوراً پہنچ گیا۔"

لباس وغیرہ از سر نو تبدیل کرنے کے بعد،

مہاراجہ نے رادھا سے کہا . . . .

"چلو چلتی ہو!"

"کہاں کا ارادہ ہے؟"

"چلو تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔"

رادھا اور مہاراجہ صاحب ایک بیوک کار میں بیٹھ کر روانہ ہوئے ایک وسیع اور شاندار عمارت کے سامنے موٹر رُکی، ایک خوب رو اور شکیل وجمیل خاتون نے مہاراجہ صاحب کا استقبال کیا، مہاراجہ صاحب نے پوچھا:-

"سب لوگ آگئے؟"

"آگئے سب لوگ!"

"لیڈی ٹمپل بھی؟"

"جی ہاں، وہ بھی!"

"اور مس فلپس؟"

"جی، وہ بھی!"

مہاراجہ صاحب آگے آگے، استقبال کرنے والی خاتون درمیان میں اور اس سے پیچھے رادھا! اس ترتیب سے یہ قافلہ، عمارت کے اندر روانہ ہوا،

ایک وسیع و عریض ہال میں منتخب مردوں اور عورتوں کا ایک ستھرا سا اجتماع تھا۔ اعلیٰ خاندان کی خواتین، آرٹ کی دلدادہ عورتیں، اعلےٰ ملازمت کی جویا، خوبصورت اور طرحدار لڑکیاں امیروں، دولتمند نوجوانوں، اور اعلےٰ طبقہ کے مردوں کو اپنے جال میں پھانسنے والی چھوکریاں اچھی خاصی تعداد میں جمع تھیں، علاوہ ازیں طبقہ امرا و تجار کے چند سر برآوردہ اصحاب بھی رونق افروز تھے۔ مہاراجہ صاحب پہنچے تو اُن کے لئے دیدہ و دل فرش راہ، کیا جانے لگا۔ بڑھ بڑھ کر استقبال کیا گیا، جسے دیکھئے اس کی یہی آرزو کہ مہاراجہ ہم سے مخاطب ہوں، ہم سے گفتگو کریں ہمارے پاس بیٹھیں۔ ہماری باتیں سُنیں، مہاراجہ صاحب بے چارے ایک! اور ان سے لطف اندوز اور مستفید و متمتع ہونے والا اتنا بڑا مجمع، وہ اپنی اس ہر دلعزیزی اور قبول خاص پر مسرور تو بہت ہوئے لیکن کس کس کے پاس بیٹھتے، کس کس سے مخاطب ہوتے، کس کس کو شرف موانست سے نوازتے، اپنی قوت فیصلہ

کو عاجز پا کر وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی جلو میں لے لئے گئے جیسے چاند ستاروں کے جھرمٹ میں ہوتا ہے اسی طرح اس وقت مہاراجہ کے گرد آسمان حسن وجمال کے ستارے ہالا کئے ہوئے تھے۔

لیڈی ٹیمپل، ایک بڑے اور اچھے گھرانے کی خاتون تھیں، شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب اُن کے نام کو روشن کرنے کے لئے یہ باقی رہ گئی تھیں۔ خود بھی اپنے گھر سے کچھ غریب نہیں تھیں اور شوہر نے اچھا خاصہ اندوختہ چھوڑا تھا، خوش قسمتی یا بدقسمتی سے صاحب اولاد بھی نہیں تھیں۔ عمر کوئی ۳۹۔۴۰ سال کی ہو گی۔ لیکن رہتی اس سج دھج سے تھیں کہ کوئی اچھے سے اچھا مبصر بھی ۲۶۔۲۷ سال سے زیادہ کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ اب ان کا بہترین مشغلہ سوسائٹیوں اور کلبوں میں وقت گذاری تھا۔ کبھی اُن پر ڈورے ڈالے جاتے تھے، کبھی یہ خود ڈورے ڈالتی تھیں، اور دونوں صورتوں میں نفع میں رہتی تھیں۔ مس فلپس کی عمر ۲۰۔۲۲ سال کی ہوگی، خوش اندام نازک بدن شوخ وطرار تعلیم یافتہ، علم مجلس میں ماہر، ابھی معاشیات میں بی۔ اے، کی ڈگری لے کر کالج سے فارغ ہوئی تھیں در پردہ مقصد تلاش معاش تھا۔ لیکن چہرہ بشرہ سے اپنا عندیہ ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ لیڈی ٹمپل سے ان کا بڑا یارانہ تھا انہی نے انہیں مہاراجہ صاحب سے ایک تھیٹر میں متعارف کرایا تھا، آج پھر ان دونوں سے ملاقات ہوئی اور بہت جلد یہ ملاقات

بے تکلفانہ اور دوستانہ ملاقات میں تبدیل ہوگئی ۔

. . . . . سامنے کی نشست پر مسٹر جونز بیٹھے ہوئے تھے ، یہ ایک بیمہ کمپنی کے گماشتہ تھے ، اُن کے پاس ایک لڑکی متمکن تھی ، عمر کوئی ۱۷ ۱۸ سال کی ہوگی ، رنگ آئینہ کی طرح صاف و شفاف ، باتیں آبِ رواں کی طرح شستہ اور شائستہ ، انداز و ادا تیر و نشتر کی طرح دل میں اُتر جانے والی اور کھُب جانے والی گفتگو جو تر سے ہو رہی ہے ، اور نگاہِ غلط انداز ،

ع وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے . . .

مہاراجہ پر پڑ رہی تھی ۔

شراب کا دَور چل رہا ہے ، اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی ہیں ، اِتنے میں مسٹر جونز کسی کام سے باہر چلے گئے ، کرسی پر وہ لڑکی خاموشی کے ساتھ بیٹھی رہی ، البتہ اس کی نگاہیں گردش کر رہی تھیں ۔ مہاراجہ کی نگاہ بھی اُس بت عربدہ جو ، پر پڑ چکی تھی کچھ عرصہ تک تو اُنہوں نے لیڈی ٹیمپل اور مس فلپس میں اپنا دل بہلائے رکھا ، پھر ضبط کا یارا نہ رہا تو لیڈی صاحبہ سے پُوچھا :۔

"یہ سامنے کون لڑکی بیٹھی ہے ؟"

"ہوگی کوئی آپ کو کیا ؟" مس فلپس نے کہا ۔

"آپ اس سے تعارف چاہتے ہیں ؟" لیڈی ٹمپل نے پوچھا ۔

"کیا مضائقہ ہے ؟" مہاراجہ صاحب نے فرمایا ۔

ایک اندازِ خاص سے لیڈی صاحبہ اُٹھیں، اس لڑکی کے پاس پہنچیں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مہاراجہ صاحب کے پاس آئیں اور کہنے لگیں،

"یہ ہیں مس ویب"

(پھر مہاراجہ کی طرف اشارہ کر کے)

"آپ ہیں مہاراجہ سورج پور"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" مس ویب نے کہا۔

"میں بھی بہت مسرور ہوا، آئیے تشریف رکھیے۔"

پاس ہی کرسی پر مس ویب بیٹھ گئیں!

مہاراجہ صاحب نے پوچھا:-

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں، آپ کے موجودہ مشاغل کیا ہیں!"

"جی ہاں، ضرور! میں ایک سال سے ایک بیمہ کمپنی میں کنویسنگ کا کام کرتی ہوں، کمپنی بہت عمدہ ہے، دُور دُور اس کی ساکھ کا شہرہ ہے،

"خوب!"

"کبھی کسی آج تک کمپنی سے کوئی شکایت نہیں ہوئی"

"بہت خوب!"

"آپ تو بیمہ کرا چکے ہوں گے؟"

"میں نے تو کئی کمپنیوں میں بیمہ کرا رکھا ہے"

"تو آپ ہماری کمپنی میں بھی کیوں نہیں بیمہ کراتے؟"

"اگر آپ کہیں تو مجھے عذر نہیں۔"

"میری تو دلی تمنا ہے۔"

"تو میں حاضر ہوں"۔

"آپ مجھے اپنا پتہ بتا دیجئے، میں کل آپ کی قیام گاہ پر حاضر ہو جاؤں گی"

"بڑے شوق سے"

یہ کہہ کر مہاراجہ صاحب نے جیب سے ایک ملاقاتی کارڈ نکالا، اور مس ڈیب کے نازک ہاتھ پر رکھ دیا، جس پر اُن کا پتہ، ہوٹل کا نام، ٹیلی فون نمبر سب ہی کچھ درج تھا۔

مس فلپس نے پوچھا۔

"آپ نے اکسلیئر میں آنے والا زمانہ" Kings to Come دیکھا؛ ایچ، جی ویلز کے افسانہ پر یہ فلم تیار کی گئی ہے، اور بہت خوب ہے۔"

"چرچا تو میں نے بہت سُنا ہے۔ اشتیاق بھی ہے، لیکن دیکھنے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی۔"

"تو آج چلئے نا"

"رادھا تمہاری کیا رائے ہے؟"۔

150/5, Bihar Colony, KARACHI.
RAJA LIBRARY. Tannery Road, BIHAR COLONY, KARACHI.

"ضرور چلیے"

"اور لیڈی ٹمپل آپ بھی چلیں گی؟"

"اگر آپ چلیں گے تو ضرور چلوں گی"

اسی وقت ٹیلیفون کے ذریعہ پانچ نشستیں محفوظ کر لی گئیں، تھوڑی دیر تک گپ شپ رہی۔ پھر مہاراجہ صاحب اپنے قافلہ کے ساتھ، جس میں اب مس دیب بھی شامل ہوگئی تھیں، تماشہ دیکھنے روانہ ہوئے۔

تماشہ سے فارغ ہوتے، تو لیڈی ٹمپل اور مس فلپس تو ایک کار پر روانہ ہوگئیں، مس دیب سے مہاراجہ صاحب نے اصرار کیا، اب اتنی رات گئے وہ کہاں جائیں گی۔ انہی کے ہوٹل پر آج شب کو، مس رادھا کے ساتھ قیام کریں۔ ذرا گفتگو بھی رہے گی مس دیب بھی راضی ہوگئیں۔ اور یہ لوگ ہائڈ پارک ہوٹل میں روانہ ہوئے، مس رادھا تو ہوٹل پہنچتے ہی درد سر میں مبتلا ہوگئیں۔ اس لئے وہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکیں، اور اپنے کمرہ میں جاکر سو گئیں۔ مہاراجہ صاحب اور مس دیب میں تبادلہ خیالات ہوتا رہا مس دیب نے پوچھا:۔

"ہندوستان تو بہت پرانا ملک ہے!"

"اتنا ہی پرانا، جتنی یہ دنیا ہے"

"بڑی رومانی سرزمین ہے"

"بہت زیادہ"

"ساتھ ہی ساتھ حیرت انگیز، ہیبتناک، اور قابل دید بھی"

(مسکرا کر) "یہ بات بھی ہے"

"میں نے سنا ہے، وہاں طرح طرح کے خطرناک سانپ ہیں لیکن مداری انہیں قابو میں کر لیتے ہیں کہ وہ کاٹنا بھول جاتے ہیں"

"آپ نے ٹھیک سنا ہے"

"سنا ہے وہاں ہاتھی اور جنگل بھی بہت ہیں۔ بڑے بڑے خوفناک شیر، چیتے، ریچھ، . . ."

"ایسے ہی جنگلوں میں تو شکار کا مزہ ہے"

"میں نے یہ بھی سنا ہے، وہاں کی زمین سونا اور چاندی اگلتی ہے قدم قدم پر قیمتی دھاتوں کی کانیں ہیں"

"یہ بھی ٹھیک ہے"

"میری تمنا ہے کہ میں دیوتاؤں کا ہندوستان دیکھوں"

"تو آپ میری مہمان بن کر چلئے، جب تک آپ کا جی چاہے رہیئے گا جب مرضی ہو واپس چلے آیئے گا"

"میں اگر چل سکی تو ضرور چلوں گی"

"بہرحال میری دعوت قائم ہے"

کافی رات گذر جانے کے بعد مہاراجہ صاحب نے اپنی خوابگاہ کا رُخ کیا اور مس دیب اپنے کمرہ میں چلی گئیں، جو اُن کے لئے خاص طور پر صاف کر دیا گیا تھا۔

دوسرے روز مہاراجہ صاحب نے مس دیب کی وساطت سے ایک لاکھ روپیہ کا بیمہ کرا لیا۔

مس دیب بہت خوش ہوئیں، کچھ اسلئے کہ ایک بڑی رقم کمیشن کی ہاتھ لگی، اور کچھ اس لئے کہ مہاراجہ صاحب سے راہ و رسم پیدا ہو گئی جو بہرحال خوش آئند تھی!

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب
(۴)
پرجامنڈل کی شورش

مہاراجہ صاحب کا ارادہ تھا کہ چند مہینے لندن گذاریں گے، پھر پیرس ویانا - برلن اور امریکہ کی سیر کریں گے - اور جی بھر کے لطف سیاحت حاصل کریں گے - مگر دفعتہً انہیں ریاست کے وزیر اعظم آنند پرکاش کا تار ملا-

"حالات بہت نزاکت اختیار کر چکے ہیں، ،،پرجامنڈل کی باغیانہ تحریک زور پکڑتی جارہی ہے - تین دن سے مکمل ہڑتال ہے، ،،ہر کے لیڈروں کا تانتا لگا

ہوا ہے ۔ رزیڈنٹ صاحب سرکار کی غیر حاضری محسوس کر رہے ہیں، مودبانہ التماس ہے کہ اگر ہو سکے تو جلد تشریف لائیے ۔"

یہ تار پاکر مہاراجہ صاحب بہت پریشان ہوئے ۔ اسی وقت انہوں نے اپنے بھروسہ کے لوگوں کی کانفرنس طلب کی اور مشورہ کیا، کہ اب کیا کیا جائے ۔

ترلوک نے کہا کہ حضور تار دے دیجئے جو مناسب سمجھو کرو، ہم اپنے وقت سے آئیں گے ۔

اودے سنگھ نے بہک کر کہا، "پرجا منڈل والے تو چاہتے ہیں راج ہمیں ملجائے ۔ مجھے بھیج دیجئے ۔ سب کا دماغ درست کر دوں گا ۔

راج منوہر نے کہا:-

"موقع نازک ہے حضور کو چلنا چاہیئے ۔"

کچھ دیر کے غور و مشورہ کے بعد یہی طے ہوا کہ سورج پور واپس چلا جائے چونکہ مہاراجہ صاحب جلد از جلد واپس جا رہے تھے ۔ اس لئے آج ہی مس رادھا، مس ویب اور مس فلپس کے ساتھ ساتھ وہ shoping خرید و فروخت کرنے نکلے، بڑی بڑی دوکانوں پر بیش بہا رقموں کی متعدد چیزیں خرید فرمائیں، ڈیڑھ لاکھ روپیہ میں اپنے لئے ایک نئی وضع کی کار خریدی جسمیں آٹھ آرام دہ نشستوں کا انتظام، غسلخانہ، باورچیخانہ اور خواب گاہ کا

انتظام سب جدا۔

رادھا کے لئے سو پونڈ کے جڑاؤ بندے خریدے گئے، جو اپنی تابش اور درخشانی کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھے۔ مس فلپس کی نظر انتخاب ہتیول کے ایک ہار پر پڑی، اور پڑی رہ گئی۔

دوکاندار نے کہا:-

"حضور بڑا بڑھیا مال ہے"

"کیا قیمت ہے؟"

"تین سو پونڈ" "بہت دام ہیں۔!"

"سرکار، ولیعہد جرمنی کی بیگم صاحبہ نے اس کے ساتھ کا ہار چار سو پونڈ کا خریدا تھا۔ اب تو قیمت گر گئی ہے"

"تمہیں پسند ہے؟" مہاراجہ نے پوچھا۔

"چیز تو اچھی ہے" مس فلپس نے جواب دیا۔

"تو لے لونا"!

مس صاحبہ نے نگاہِ تشکر سے مہاراجہ کو دیکھا، اور نظر نیچی کر لی،

دوکاندار نے مال پیک کیا، اور لا کر سامنے رکھ دیا۔

مس دیب سے مہاراجہ نے پوچھا۔

"تمہیں کوئی چیز پسند نہیں آئی؟"

"مجھے تو یہ انگوٹھی پسند ہے۔"

مہاراجہ نے قیمت پوچھی، ڈیڑھ سو پونڈ، معاملہ طے ہوا۔ اور انگوٹھی، مس ویب کی انگشتِ حنائی پر ستارے کی طرح چمکنے لگی۔

سارا دن مہاراجہ نے اپنے اور اپنے حوالیوں موالیوں کے لئے خرید و فروخت میں صرف کر دیا، واپسی میں انہوں نے مس ویب سے پوچھا۔

"تو ہندوستان کے متعلق کیا ارادہ ہے چلتی ہو؟"

"آپ اگر سہارا دیں تو ضرور چلوں گی لیکن، ایک مشکل ہے"

"وہ کیا؟"

"میرا ایک بھائی ہے، گریجویٹ ہے لیکن عرصہ سے بیکار ہے اس کے روزگار کا اگر بندوبست ہو جائے، تو بڑے شوق سے چلوں گی، میں کچھ عرصہ بعد واپس آجاؤں گی، وہ وہیں برسرِ روزگار رہے گا۔"

"تمہارے بھائی کو ریاست میں ملازمت مل سکتی ہے، لیکن ایک شرط ہے!"

(خوش ہو کر) "وہ کیا؟"

"تمہیں پھر واپس آنے کی اجازت نہیں ملے گی!"

"میں وہاں رہ کر کیا کروں گی؟"

"یہ متعین کرنا میرا کام ہے۔"

"کیا مجھے بھی کوئی ملازمت مل جائے گی ۔"

"تمہارا کام ملازموں پر حکومت کرنا ہوگا ۔"

مس دیب کے چہرہ پر سُرخی دوڑ گئی ، وہ متبسم ہوئیں اور خاموش ہوگئیں مہاراجہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا ،

"تم خود غور کرو ، یہاں تمہاری زندگی محنت اور مشقت کی زندگی ہے وہاں تمہاری زندگی عیش و آرام کی زندگی ہوگی ، تم اس لئے نہیں بنی ہو کہ زمانہ کے شدائد اور مصائب برداشت کرو ، تم اس لئے پیدا کی گئی ہو کہ پھولوں کی سیج پر اپنی زندگی کے خوشگوار دن بسر کرو !"

مس دیب نے ایک باتصویر رسالہ اُٹھا لیا ، اور اسے دیکھنے لگیں کچھ دیر خاموش رہ کر مہاراجہ نے پھر کہا ۔

"میں تمہارا فیصلہ سُننا چاہتا ہوں ۔"

"میں والد سے پوچھ کر جواب دوں گی ۔"

"لیکن میں تو ابھی رختِ سفر باندھ رہا ہوں ۔"

"پہلے آپ میرے بھائی سے تو مل لیجئے ۔"

"ہاں ، انہیں آج مجھ سے ملا دو !"

شام کو ، مس دیب ، ایک خوش وضع قبول صورت اور گراں ڈیل نوجوان کو لے کر آئیں ۔

"میرا بھائی ہے جانسن!"

"اچھا یہ ہیں مسٹر جانسن، تمہارے بھائی؟"

"جی!"

"کہیئے مسٹر جانسن آپ ہندوستان چلیں گے؟"

"بسر و چشم!"

"اور یہ آپ کی بہن مس دیب؟"

"اگر آپ کا ارشاد ہو گا، تو یہ بھی چلیں گی"

(مس دیب سے مخاطب ہو کر) "کہیئے کیا ارادہ ہے؟"

"جو جانسن کہہ رہا ہے (مسکرا کر) اب تو مجھے چلنا ہی پڑے گا"

"بہت بہت شکریہ"

دوسرے دن مہاراجہ صاحب نے انگلستان سے کوچ کیا، اور
ہندوستان روانہ ہو گئے۔

سورج پور جب پہنچے، تو معلوم ہوا کہ حالات بہت ابتر ہیں، دو سو
سے زائد آدمی گرفتار ہو چکے ہیں۔ ایک مرتبہ حکام کو گولی بھی چلانا پڑی
جس میں ایک درجن سے زائد زخمی ہوئے۔ اور کئی جان سے گئے۔ شور
اب بھی ختم نہیں ہوئی، گرفتاریوں اور سختیوں سے آگ دبی ہے ابھی نہیں

نہ معلوم کب بھڑک اٹھنے لگے - آج پھر ہڑتال ہے، شام کو راجہ پارک میں جلسہ ہے جس میں دہلی سے مشہور سوشلسٹ لیڈر مسٹر دوارکا داس، شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں - مہاراجہ نے قدرے برہمی کے ساتھ حالات سُنے - میز پر گھونسہ مارا، اور باآواز بلند ارشاد فرمایا:-

"دوارکا داس کو گرفتار کر لو، دوکانیں جبراً کھلواؤ، جلسہ نہ ہونے دو"

وزیر اعظم نے کہا:-

"سرکار دوارکا داس کو گرفتار کیا گیا تو برطانوی ہند میں ہل چل مچ جائے گی . . . دوکانیں جبراً کھلوائی گئیں تو فضا اور نازک ہو جائے گی - جلسے کی ممانعت پہلے ہو جاتی تو کوئی بات نہیں تھی - اب اگر روکا گیا - تو شاید گولیاں چلانی پڑیں"

"کوئی مضائقہ نہیں، تم مجھے ڈراتے ہو؟ ایں! (کڑک کر) بولو!"

(لرز کر) نہیں سرکار میں تو ——!

"میں تو کا بچہ"!

اب وزیر اعظم صاحب نے سمجھ لیا، اگر کچھ بولے تو ٹھوکروں سے تواضع ہو گی خاموش ہو گئے!

مہاراجہ صاحب نے پوچھا:-

"پہلے ہی سے اُن سرکشوں کی خبر کیوں نہیں لی گئی؟"

میں تو ان بدمعاشوں کو منہ بھی نہیں لگاتا۔ اور جب زد میں آ
جاتے ہیں تو ایسا شکنجہ میں کستا ہوں کہ زندگی بھر یاد کریں، مُرلی دھر بھی تو
بڑے لیڈر بنتے تھے، آج آٹھ برس ہو گئے۔ اب تک جیل میں چکی پیس رہے
ہیں اور وہ فاروقی صاحب، وہ تو جب دیکھو تب کفن سر سے لپیٹ کر میدان
میں اُترا کرتے تھے، ایسی گولی پڑی کہ آہ بھی تو نہ کر سکے، اور سب پہنچ گئے
جہنم میں ۔"

"پھر اب کی تم اتنے بودے کیوں ہو گئے ؟"

"سرکار! ایک تو یوں کہ حضور نہیں تھے۔ دوسرے اس لئے کہ یہ نئے
رزیڈنٹ صاحب، اصلاحات اصلاحات کا ہر وقت چرچا کیا کرتے
ہیں، اور تیسرے یہ کہ کرنل سوبھا ناتھ کو آپ نے وزیر مقرر فرمایا، لا اینڈ
جسٹس کا، وہ ظاہر میں تو ریاست کے خیر خواہ ہیں اور ویسے حالت یہ ہے
کہ گھر پر ان سرکشوں کو دعوت دیتے ہیں، اُن سے ملاقات کرتے ہیں،
ان کی عزت بڑھاتے ہیں، اُنہیں جلسے کرنے اور جلوس نکالنے، اور تقریر
کرنے کی بے دھڑک اجازت دے دیتے ہیں، میں اعتراض کرتا ہوں
تو کہہ دیتے ہیں میں اپنے فعل کا ذمہ دار ہوں، مہاراجہ صاحب کو جواب
دے لوں گا، اب حضور ہی انصاف فرمائیں، میں کیا کروں کیا نہ کروں"

"آپ جائیے کرنل صاحب کو میرے پاس بھیج دیجیے!"

وزیر اعظم صاحب جان کی خیر مناتے ہوئے رخصت ہوئے، اب کرنل سوبھاناتھ کی باری آئی!

"آج راجہ پارک میں جلسہ ہو رہا ہے؟"

"جی سرکار!"

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"یہ جلسہ نہیں ہو سکتا۔"

"بہت خوب سرکار۔"

"آج ہڑتال ہے؟"

"جی سرکار!"

"میں شام کو گشت کروں گا شہر کا۔ اس وقت بازار میں کوئی دوکان بند نہ ہونی چاہیئے۔"

"بہت خوب سرکار!"

"پنڈت دوارکاداس آئے ہیں؟"

"جی سرکار!"

"انہیں فوراً گرفتار کر لیجیے مقدمہ چلایئے اور قرار واقعی سزا دلوایئے!"

"بہت خوب سرکار!"

کرنل صاحب یہ احکامات لے کر واپس جانے لگے، دروازہ تک

پہنچے تھے کہ مہاراجہ نے فرمایا :-

" کرنل سوبھا ناتھ - ! "

" جی سرکار "

" آپ کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ باغیوں سے ساز باز رکھتے ہیں ؟ "

" کون کہتا ہے سرکار ؟ "

" کوئی کہتا ہے ، یہ بتائیے ، سچ ہے نا "

" بالکل جھوٹ سرکار ! "

کرنل صاحب جیسے ہی اپنے دفتر میں پہنچے انہوں نے محکمۂ پولیس کے ذمہ دار اصحاب کو طلب فرمایا مہاراجہ صاحب کے احکامات سنائے اور تاکید کی کہ تمام احکامات فوراً بروئے کار لائے جائیں ، اگر ذرا بھی تاخیر ہوئی تو سخت تعزیری کارروائی کی جائے گی -

مسٹر آتما رام سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بازار کا رُخ کیا ، دوکانداروں کو بلایا اور اُن سے کہا تھوڑی دیر کے بعد مہاراجہ صاحب شہر کا گشت کریں گے - دوکانوں کا بند رہنا ، اُن کی توہین ہے ، لہٰذا فوراً دوکانیں کھولئے ، اور کاروبار جاری کیجئے "

ایک دوکاندار نے کہا ،-

"حضور ہم انصاف چاہتے ہیں"

" دوسرا بولا :۔

"سرکار جب تک ہماری مانگ (مطالبہ) نہیں پوری ہوگی دوکانیں نہیں کھلیں گی"

"ہمارے بہت سے لیڈر جیل میں ہیں ہمارے بھائیوں پر گولیاں ....."

آتمارام نے بجلی کی طرح کڑک کر اور بادل کی طرح گرج کر کہا :۔

"بس بکواس بند کرو ، دوکانیں کھلیں گی ابھی کھلیں گی ، اسی وقت کھلیں گی اگر نہ کھلیں ، تالے تڑوا کے سب مال لٹوا دوں گا ، کسی نے چوں کی تو سر توڑ دوں گا ، بولو دوکانیں کھولتے ہو یا نہیں :۔

چند بڑے بوڑھے آگے بڑھے ، کہنے لگے :۔

"سرکار کھولیں گے کیوں نہیں ! یہ ابھی بچے ہیں ، لوگ بھڑکاتے ہیں یہ جوش میں آجاتے ہیں ۔ مہاراجہ صاحب ہمارے بھگوان سمان ہیں ۔ ان کا کہنا کوئی ٹال سکتا ہے ؟

آتمارام نے کہا ۔

"اچھا اب میں جاتا ہوں ، تھوڑی دیر میں پھر واپس آتا ہوں مجھے دوکانیں کھلی ملیں"

یہ کہہ کر آتما رام گھوڑے پر بیٹھے اور آگے روانہ ہو گئے۔

مسٹر رضوی سب انسپکٹر اس خدمت پر مامور ہوئے تھے کہ دلاور رامو کشن سنگھ اور ہیرا لال پرجا منڈل کے لیڈروں کو فوراً گرفتار کریں۔ سب سے پہلے وہ ہیرا لال کے گھر پہنچے، اتفاق سے رامو اور کشن سنگھ بھی وہیں مل گئے، سب انسپکٹر نے کہا:-

"خوب آپ صاحبان سے ملاقات ہو گئی۔"

"ارشاد کیسے تکلیف فرمائی۔"

"آپ حضرات اب زیر حراست ہیں۔"

"کوئی سبب؟"

"حکم حاکم"

"ہم تیار ہیں"

سب انسپکٹر صاحب آگے بڑھے تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دیں لاری پر بٹھایا، اور جیل روانہ کر دیا۔ یہ سب کچھ اتنی عجلت میں ہو گیا۔ لوگ سمجھ بھی نہیں سکے کیا معاملہ ہے، اور اس وقت آس پاس لوگ تھے بھی کم، دوپہر کا وقت سنسان محلہ، شہر کی فضا ناساز گار . . . . یہاں سے فارغ ہو کر سب انسپکٹر صاحب دلاور کے مکان پہنچے، پیچھے پیچھے چند سپاہی، آگے آگے مسٹر رضوی، دروازہ پر دستک دی ایک آٹھ

نو برس، کا لڑکا باہر نکلا، سپاہی نے پوچھا۔

"دلاور ہیں"

"ہاں ابھی سوئے ہیں، بخار ہے"

"جا بُلا لا"

لڑکا اندر چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد برآمد ہوا، اور کہنے لگا "وہ بیمار ہیں اپنا نام بتاؤ"

سپاہی نے بڑھ کر ایک چانٹا لگایا، لڑکا روتا ہوا گھر کے اندر چلا، اور سپاہی نے کڑک کر آواز دی۔

"دلاور خاں! آتے ہو تو آؤ نہیں تو پولیس کے سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں!"

دلاور خان شدید بخار میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنے لڑکے کو دیکھا روتا چلا آ رہا ہے۔ پھر پولیس مین کی آواز سنی۔ لڑکے سے تو کچھ نہ کہا گرتے پڑتے ایک چادر اوڑھ کر باہر آئے، سپاہی نے کہا۔

"تم گرفتار کر لئے گئے"

"کیا میں چند منٹ کے لئے اندر جا سکتا ہوں؟"

"نہیں!"

.... یہ کہہ کر سپاہی آگے بڑھا، دلاور نے ہاتھ بڑھا دیا اس

نے ہتھکڑی پہنائی، اور پولیس خاں صاحب کو لے کر جیل کی طرف روانہ ہوگئی۔

راجہ پارک پر مسٹر پرکاش ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے مسلح اور لٹھ بند سپاہیوں کی مدد سے قبضہ کر لیا۔ حکم نافذ کر دیا کوئی شخص پارک کے اندر نہ داخل ہو سکے۔

وقت مقررہ پر جلسہ میں شرکت کے لئے عوام کا اجتماع شروع ہوا کچھ عرصہ کے بعد انبوہ در انبوہ خلقت جمع ہوگئی۔ پارک کے دروازہ پر ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا، لیکن اندر کوئی نہ جا سکتا تھا، اس لئے کہ پولیس تعینات تھی اور کسی شخص کو اندر نہیں جانے دیتی تھی۔

دلاور خاں، کشن سنگھ، ہیرا لال، اور رامو پرجا منڈل کے لیڈر تھے۔ اب شہر میں ان کی گرفتاری کی خبر پھیل چکی تھی۔ اس خبر سے مجمع اور متاثر تھا۔ ادھر پولیس نے دروازے کے سامنے جو لوگ کھڑے تھے ان پر تشدد شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سارے مجمع میں عام برہمی پیدا ہوگئی۔ اس خبر نے کہ منڈل کے لیڈروں کو ہتھکڑی پہنا کر جیل لیجایا گیا، مجمع میں بہت زیادہ اشتعال پیدا کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے جے کاروں کی آواز سے فضا میں ایک تموج پیدا ہوا، پولیس والوں نے مجمع کو خاموش کرنے کے لئے زور و بازو کا مظاہرہ شروع کیا تو مجمع نے اینٹ کا جواب پتھر سے د

مجمع کے بعض بے قابو لوگوں نے پولیس پر خشت باری کی ۔ فوراً پرکاش بابو نے لٹھ بند پولیس کو حکم دیا کہ وہ لاٹھی چارج کرے ، جب اس سے بھی فضا درست نہیں ہوئی تو مسلح پولیس آگے بڑھی ، سواروں نے گھوڑے دوڑانا شروع کئے اور سپاہیوں نے گولی چلانا ، اب مجمع میں ابتری پیدا ہوئی کئی آدمی گھوڑوں کے نیچے کچلے گئے ، بہت سے گولیوں سے جاں بحق ہوئے اور ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی ۔ پولیس نے مجمع کے لوگوں کا دوڑ دوڑ کر تعاقب کیا ، اس کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ کئی آدمیوں کی پیٹھ پر سنگینوں اور گولیوں کے نشانات تھے ۔

شام کو حسب قرارداد مہاراجہ صاحب شہر کے گشت کے لئے نکلے جب وہ بازار میں پہنچے تو چند دوکانوں کے سوا سب دوکانیں کھلی ہوئی تھیں ، مہاراجہ کی جے" ان نعروں کے ساتھ ان کا استقبال ہوا بعض بڑے دوکانداروں نے مہاراجہ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالنے کی عزت حاصل کی ، آگے بڑھے تو شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا ، معلوم ہوتا تھا در و دیوار پر سوگ برس رہا ہے ، ابھی مہاراجہ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں اطلاع ملی ۔ راجہ پارک میں گولی چلی ۔ مجمع وہاں سے تو منتشر ہوگیا ، لیکن اب غضبناک حالت میں شہر کا رخ کر رہا ہے ۔ یہ خبر سننے کے بعد شاہی سواری محل واپس ہوگئی ، اور پولیس کے انتظامات اور سخت

ہو گئے ۔

شہر کے اندر داخل ہونے کے بعد جب مجمع بازار میں داخل ہوا تو دوکان داروں کی غداری دیکھ کر اور زیادہ مشتعل ہوا اور دکانیں لوٹنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، دوکانداروں نے لاکھ فریاد کی چیخے چلاتے، التجائیں کیں، لیکن برہم مجمع کس کی سنتا ہے؛ تھوڑی ہی دیر میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ دوکانوں پر کوئی جھاڑو دے گیا ہے، قیمتی قیمتی چیزیں زمین پر پڑی تھیں، اور بہت سا حصّہ اِدھر اُدھر ہو گیا تھا - فوراً ٹیلی فون کے ذریعہ کوتوالی میں اطلاع کی گئی اسی وقت مسلح پولیس اور سوار پولیس کے دستے پہنچے، اور آتے ہی اُنہوں نے اپنا کام پوری سفاکی اور درندگی سے شروع کر دیا، مجمع یہاں سے آگے بڑھا، اور بڑھتے بڑھتے ایک دوسرے محلے میں پہنچا - یہاں ایک چھوٹی سی پولیس چوکی تھی اس پر حملہ کر دیا، سپاہیوں نے بڑی مشکل سے بھاگ کر اپنی جان بچائی،

اب چونکہ حالات بہت زیادہ نازک ہو چکے تھے - اس لئے فوج طلب کی گئی - اور فوج نے آتے ہی شہر کو اپنے چارج میں لے لیا، اندھا دھند تعزیر و عقوبت کا سلسلہ شروع ہوا، جس شخص پر ذرا بھی شبہ ہوا کہ یہ مفسدوں میں شامل رہے فوراً اسے سزا دے دی گئی، اور سزا بھی معمولی نہیں، قرار واقعی!

آخر شب میں پولیس کی مشینری پھر حرکت میں آئی اور کئی سو گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں، بہت سے لوگ سوتے ہوئے بستروں پر سے گرفتار کر لئے گئے جس شخص کے متعلق مخبری ہوئی کہ یہ فسادیوں میں شامل ہے، یا یہ شک ہوا کہ اس نے کوئی خلافِ قانون حرکت کی ہے وہ فوراً گرفتار کر لیا گیا اور اقبالِ جرم کے لئے جوتے، گھونسے، مکے، تھپڑ، ہنٹر، لاٹھی، مرچ کی دھونی کوئی حربہ نہیں چھوڑا گیا۔ دن نکل آنے کے بعد تلاشیوں کا آغاز ہوا، قومی کارکنوں، اور سیاسی لیڈروں کے مکانات دفاتر اور مجالس کی تلاشی لی گئی۔

ہیرالال کے یہاں پولیس کا دستہ تلاشی لینے پہنچا، سب سے زیادہ مشکوک چال چلن کے یہی کارکن تھے۔ پولیس ہمیشہ ان سے کھٹکتی رہتی تھی، وہ بیچارے تو گرفتار ہو چکے تھے، گھر میں ان کی بوڑھی ماں اور نوجوان بیوی تھیں، برقنداز نے آواز دی، ماں دروازہ پر آئیں۔

"کیا ہے بھیا؟"

"ہم تلاشی لینے آئے ہیں۔"

"یہاں کیا ہے بیٹا! آؤ دیکھ لو۔"

"یہ کہہ کر ہیرالال کی ماں نے وسنتی سے کہا کہ وہ پردہ میں ہو جائے، جب وہ اوٹ میں ہو گئی تو سپاہی اندر داخل ہوئے، آتے ہی انہوں نے

RAJA LIBRARY. ★
Tannery Road,
COLONY, KARACHI.

سارے گھر کا محاصرہ کرلیا، ایسی مکمل ناکہ بندی کہ چوہا بھی اندر نہ جا سکے اور نہ کوئی چیونٹی باہر نکل سکے۔ اس سے فارغ ہو کر گھر کے ایک ایک کونہ کی تلاشی لی گئی، سب سے پہلے تو وہ کمرہ دیکھا گیا جس میں ہیرالال کی نشست رہتی تھی۔ صندوقچہ کی ایک ایک چٹ، بکس کا ایک ایک کاغذ، اور میز کے ایک ایک کونہ کی، بہت احتیاط اور کمال دقت نظر سے تلاشی لی گئی، دیوار پر چند لیڈروں کی تصویریں آویزاں تھیں ان پر قبضہ کیا گیا، اور پھر جس کمرہ میں ہیرالال کی ماں اور سنتی کا قیام تھا اسے دیکھا گیا، اور کوئی زاویہ اور کوئی گوشۂ نگاہ نقد سے محفوظ نہیں رہا۔ بعدازاں باورچی خانہ، غسلخانہ، بیت الخلاء کی باری آئی اور یہاں بھی خوب خوب داد تحقیق و جستجو دی گئی، تقریباً تین گھنٹہ کے بعد پولیس پارٹی یہاں سے روانہ ہوئی، اسی طرح منڈل کے دوسرے کارکنوں کے یہاں بھی پولیس پہنچی، اور کوئی مشتبہ چیز ملی تو اس پر قبضہ کیا، نہ ملی، تو بھی اپنا رعب جتانے کو چیخ پکار ڈانٹ ڈپٹ کا مظاہرہ تو کر ہی دیا۔

فوج کی مداخلت، اور پولیس کے تشدد نے سورج پور پر ایک خاموشی طاری کر دی، سوگوار خاموشی، ایسی خاموشی جس پر موت کا دھوکا ہوتا تھا۔

چند روز کے بعد، باقاعدہ عدالتی کارروائی شروع ہوئی، کچھ لوگ جلاوطن کر دیئے گئے، کچھ لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا، پنڈت دوارکا داس نے، چونکہ ریاست سے باہر جانے سے انکار کر دیا تھا، اس لئے وہ ایک غیر معین عرصہ تک کے لئے نظر بند کر دیئے گئے، باقی لوگوں میں سے دلاور خاں، اور رامو کو پانچ پانچ سال، اور کشن سنگھ اور ہیرا لال کو آٹھ آٹھ سال کی سزائے قید بامشقت کا حکم سنا دیا گیا، نیز اول الذکر پر دو دو سو روپیہ اور آخر الذکر پر پانچ پانچ سو روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں چھ چھ مہینہ کی سزائے مزید!

چونکہ ان مجرمین میں سے کوئی بھی جرمانہ داخل عدالت نہیں کر سکا اس لئے پولیس کو حکم ہوا کہ وہ اُن کی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ فروخت یا نیلام کر کے وصول کرے،

کشن سنگھ تو ایک ایسے آدمی تھے جن کے متعلقین نے کہیں سے انتظام کر کے جرمانہ ادا کر دیا۔ دلاور خاں کے دروازہ پر دو بیل بندھے ہوئے تھے، وہ نیلام کر دیئے گئے ۵۰ روپیہ وصول ہوئے، گھر کے بعض برتن بھی نیلام ہوئے، کچھ ان سے وصول ہوا ..... مکان کے سامنے تھوڑی سی افتادہ زمین تھی جس پر وہ ایک باغ لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے، وہ بھی نیلام کر دی گئی، اس طرح ان کا جرمانہ وصول ہوا،

رامو کے ہاں کچھ نہیں ملا، پھر بھی اس کے گھر والوں کو کافی دق کیا گیا ہیرالال کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی رقم ادا کرتے، لیکن پھر بھی بیوی کے چھوٹے موٹے زیور، گھر کے ٹوٹے پھوٹے برتن اور ایک کھیت کی پٹی داری کی اتنی قیمتی نکلی جس نے ان کا جرمانہ ادا کر دیا،

ان گرفتاریوں اور سزایابیوں کے بعد شہر میں ایک عام سکون پیدا ہو گیا، لوگ ایک دوسرے سے سیاسی معاملات پر باتیں کرتے ہوئے ڈرتے تھے، انہیں اندیشہ تھا اگر ان کی نقل و حرکت مشتبہ سمجھی گئی تو اُن کا بھی وہی حشر ہوگا۔ جو رامو کا ہوا، ہیرالال کا ہوا، دلاور کا ہوا۔

مہاراجہ صاحب اپنی اس فتحمندانہ کامیابی پر بہت مسرور تھے، انہوں نے مسٹر جانسن کو انسپکٹر جنرل پولیس کے منصب پر فائز کر دیا، ۱۲اسو روپیہ ماہوار تنخواہ، بنگلہ، موٹر، پٹرول اور ڈرائیور سرکاری امس وبیب ایک ہزار ماہوار پر، مہاراجہ کے پرسنل اسٹاف میں داخل کر لی گئیں۔ بنگلہ کی اُنہیں ضرورت نہیں تھی، اس لئے کہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں، موٹر انہیں بھی سرکار کی طرف سے ملا تھا!

واپسی کے بعد، کچھ عرصہ تک مس رادھا کی آمدورفت مہاراجہ کے ہاں رہی۔ پھر یکلخت ان کا آنا بند ہو گیا، ایک روز ان کے والد موہن لال سے مہاراجہ نے کہا:-

کئی روز سے رادھا نہیں دکھائی دیتی ؟"

"وہ کئی روز سے بیمار ہے سرکار!"

"بیمار ہے ؟ کیا بیماری ہے ؟

"کچھ خاص شکایات ہیں"

"کہئے تو!"

(آبدیدہ ہوکر) حضور نے اس پر نوازشیں کیں ، اب کچھ اور نوازشوں کی ضرورت ہے"

"کیا مطلب؟"

"رادھا اب لڑکی نہیں عورت ہے! اور کچھ دنوں میں وہ ماں بھی بن جائے گی!"

"اچھا، میں آپ کا مطلب سمجھا . . . . . یہ نہیں ہوسکتا . . . ! میں انتظام کرتا ہوں . . . آپ بیٹھئے! . . . ."

مہاراجہ نے اپنے اے ، ڈی ، سی کو بلایا اور حکم دیا، پرکاش کو بلاؤ ، پرکاش بابو تشریف لائے ۔

"آپ نے اب تک شادی نہیں کی ؟"

"نہیں حضور"۔

"ہم انتظام کرتے ہیں، کیا رائے ہے ؟"

"جیسی حضور کی مرضی"

"مس رادھا کو تم نے دیکھا ہے؟"

"دیکھا ہے سرکار!"

"ہم چاہتے ہیں، تم ان سے شادی کرلو"

"جیسا سرکار کا حکم ہو!"

"پرکاش بابو کے جانے کے بعد مہاراجہ نے موہن لال سے کہا،۔

"تم مطمئن رہو رادھا بہت خوش رہے گی۔ پرکاش اسے کبھی ناراض نہیں کرسکتا"

پھر فرمایا،

"جہیز میں دوں گا، تمام مصارف میرے ذمہ!"

موہن لال منہ لٹکائے سر جھکائے واپس ہوئے، سمجھ رہے تھے، رادھا ہرجائی تنس بنے گی، پلے باندھی گئی پرکاش بابو کے۔

تھوڑی دیر کے بعد، مہاراجہ نے ڈاکٹر تیواری کو بلایا، اُن سے کچھ راز و نیاز کی باتیں کیں، اور پھر تاکید کی کہ رادھا کا علاج کریں،

ہسپتال سے صحتیاب ہوکر جب رادھا واپس آئی تو بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے پرکاش بابو کے ساتھ اس کا عقد ہوا خود مہاراجہ

صاحب نے بہ نفس نفیس اس تقریب میں شرکت کی، اور تمام مصارف بکمال خندہ پیشانی اپنی جیب خاص سے ادا کئے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ پرکاش بابو کو عہدہ میں ترقی دی، تنخواہ میں اضافہ کیا اور انعامات خصوصی سے مالامال کیا موہن لال کا غم تو مہاراجہ کے نوازشہائے فراواں سے کم ہو گیا لیکن رادھا کی صورت اب تک غمگین تھی اور پرکاش بابو بھی کچھ زیادہ خوش نہیں تھے ؎

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب
(۵)

بمبئی میں رنگ رلیاں!

دو تین ہفتوں تک مہاراجہ صاحب سورج پور میں مقیم رہے، جب ریاست کی شورش بالکل ختم ہوگئی، تو ان کا جی چاہا کہ تبادلہ آب و ہوا کے لئے کہیں تشریف لے جائیں۔ نگاہِ انتخاب بمبئی پر پڑی، فوراً انتظامات ہوئے اور مع اپنے اسٹاف کے، مہاراجہ صاحب اسپیشل ٹرین پر بمبئی

روانہ ہو گئے، قیام ، سورج پور پیلیس " میں ہوا، مہاراجہ کے اجداد نے یہ محل ، سمندر کے کنارے تعمیر کرایا تھا، جب سے اب تک اس میں ہر گدی نشین کے عہد میں برابر اضافے ہوتے رہے ، موجودہ مہاراجہ صاحب نے چند ضروری تبدیلیاں کیں تھیں -

جیسے ہی خبر اڑی کہ مہاراجہ صاحب بمبئی آئے ہیں، عقیدت مندوں جاں نثاروں، اور ضرورتمندوں کا تانتا لگ گیا، کسی کو وظیفے کی ضرورت تھی کسی کو منصب کی - کوئی ملازمت چاہتا تھا، کوئی تکمیل تعلیم، کے لئے انگلستان جانا چاہتا تھا،

مہاراجہ صاحب کس سے ملتے اور کس سے نہ ملتے - آسان ترکیب یہ نکالی کہ پرائیویٹ سکرٹیری کو ہدایت کردی، اس نے آئندورند کو بجا پایا نہ مناسب سمجھا تو کہہ دیا، مزاج ناساز ہے - ابھی ملاقات نہیں ہوسکتی -

البتہ ایک گروہ ایسا تھا جو بے روک ٹوک، ہر وقت مہاراجہ صاحب سے نیاز حاصل کر سکتا تھا، وہ گروہ تھا، مہذب طوائفوں، خانہ نشیں ریڈیو اور فلم ایکٹرسوں کا اس طبقہ کے ہر فرد کے لئے قصر شاہی کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے -

مس رویا اور مس ثریا کی آمدورفت بہت زیادہ تھی، کبھی کبھی تو ایسا ہوتا - مہاراجہ کا جی گھبرایا ، دو ایک مصاحبوں کو ساتھ لیا - کبھی مس سوبا

کے بنگلہ پر پہنچ گئے، کبھی مس ثریا کے کاشانے پر رونق افروز ہو گئے، جہاں بھی جاتے، دیدہ و دل فرشِ راہ کیے جاتے، فوراً طبلہ اور سارنگی کی آوازوں سے کمرہ گونجنے لگتا۔ مس ثریا کی تانیں، ان کا لحن، ان کا انداز موسیقی، مہاراجہ پر جادو کی کیفیت طاری کر دیتا، وہ کچھ کھو سے جاتے!

بارش کا موسم تھا، موسلا دھار پانی برس رہا تھا، ٹھنڈی ہوا دل و دماغ پر کیف و سرور کا ایک عجیب عالم طاری کر رہی تھی، سورج پور پیلس کے ایک بڑے کمرہ میں مہاراجہ ٹہل رہے تھے، سامنے برآمدہ تھا، برآمدہ کے سامنے سمندر لہریں مار رہا تھا۔ اس کی بلند و بالا موجیں پیلس کی فصیل سے آکر ٹکراتی تھیں، اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، مہاراجہ صاحب لپکے:-

"ہلو، ہلو"

"کون مس رُوپا؟"

"ہاں ہاں! کہیے کہیے!! میں ہی ہوں، میں ہی بول رہا ہوں"

"آپ جوہو جانا چاہتی ہیں؟"

"میں بھی چلوں؟ (قہقہہ لگا کر) میرا چلنا ضروری ہے؟ اچھی بات!"

"یہیں آجایئے، ساتھ ساتھ چلے چلیں گے"

تھوڑی دیر میں ایک موٹر دروازہ پر آکر رکی، اور ایک شانِ دلربائی

کے ساتھ، مس رُوپا بصد ناز و انداز برآمد ہوئیں۔ مہاراجہ نے اپنے کاندھے کا سہارا دے کر اُنہیں اُتارا، اور اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے، مہاراجہ نے کہا۔

"اس وقت تم جوہو کیوں چل رہی ہو؟"

"یہ موسم، یہ رُت یہ سماں یہ رات، اور گھر کا قیدخانہ؟"

(ہنس کر) "ہاں! ہے تو یہی بات، جوہو پر تو اس وقت رومان برس رہا ہوگا۔"

"اور کیا، اسی لئے تو کہتی ہوں، چلیئے۔"

"میں کب انکار کرتا ہوں، چلو نا۔"

جوہو پر ایک شاندار کوٹھی، مہاراجہ صاحب نے کرایہ پر لے رکھی تھی فوراً وہاں ٹیلی فون کیا گیا۔ اور تھوڑی دیر میں مع خدم وحشم کے مہاراجہ صاحب جوہو روانہ ہوگئے۔

اوپر کا کمرہ بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، ایک صوفے پر مہاراجہ صاحب متمکن تھے، پاس ہی رُوپا بیٹھی تھی، بازو عریاں، گھٹنے تک ٹانگیں برہنہ، سر دوپٹہ سے محروم، مہاراجہ نے اسکی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا اور کہا،

"آج تو تم عجب سج دھج سے آئی ہو؟"

"میں تو کوئی بات نہیں پاتی۔"

"تم آئینہ بھی دیکھتی ہو؟"

"کیوں نہیں دیکھتی؟"

"پھر تو تم اپنے اوپر فریفتہ ہو چکی ہو گی؟"

(مسکرا کر) "اب آپ لگے بنانے۔"

"میں بناتا نہیں سچ کہتا ہوں۔"

"تمہیں اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔"

(اور قریب آکر، ہاتھ میں ہاتھ لے کر) "کیوں؟

خیر تو ہے؟ تم بیزار کیوں ہو؟ پریشانی کی کیا بات ہے؟"

(آبدیدہ ہو کر) "کچھ نہیں۔"

"کچھ تو کہو، یہ دفعتہً تمہاری حالت کیا ہو گئی؟"

"کچھ نہیں، یونہی ایک بات یاد آگئی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"آپ سن کر کیا کیجئے گا؟"

"میں ضرور سنوں گا، کیا تم مجھ سے اپنے حالات چھپاؤ گی۔"

"نہیں، یہ بات تو نہیں ہے۔"

"تو کہو نا۔"

"نہیں یہ کہہ رہی تھی کہ . . . . !"

"ہاں! کیا ہوا؟"

"سیٹھ صاحب سے آج میری لڑائی ہو گئی، میں نے کمپنی سے استعفا دے دیا۔"

"کیوں؟"

GLORIOUS LIBRARY 180/3, Bihar Colony KARACHI

"اب وہ حد سے بڑھ رہے تھے۔"

"یعنی؟"

"وہ چاہتے تھے، میں کمپنی میں بھی کام کروں اور ساتھ ہی ساتھ پرائیویٹ طور پر ان کی بیوی بھی بنی رہوں۔"

"یہ بات تھی؟"

"مجھے یہ گوارا نہ ہوا۔ میں نے دو چار سخت سست باتیں کہہ دیں کہنے لگے، مس رقیہ پھر ہمارا آپ کا نباہ نہیں ہو سکتا، میں نے کہا . . . . . سیٹھ صاحب نباہ نہیں ہو سکتا تو بندی چلی۔ یہاں کسی کے دبیل نہیں ہیں۔ کام کرتے ہیں اور تنخواہ لیتے ہیں۔ باقی اگر آپ یہ سمجھیں کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے تو یہ آپ کی غلطی ہے بھول ہے۔ یہ کہہ کر میں اٹھی، سیٹھ صاحب کہنے لگے، سنو تو کہاں جاتی ہو، تم تو خفا ہو گئیں، کمپنی تمہاری ہے، میں تمہارا ہوں، میری دولت تمہاری ہے

.... سب کچھ تمہارا ہے۔ تم روٹھتی کیوں ہو؟ میں کسی خدمت سے کب باہر ہوں؟ یہ کہہ کر انہوں نے ہزار ہزار کے دو نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیئے، میں نے نوٹ اُن کے منہ پر پھینک مارے، اور کہہ دیا، نہ میں آپ کی۔ نہ کمپنی میری، مجھے آپ کے ہاں کام نہیں کرنا ہے۔ یہ کہا اور چلی آئی، انہوں نے لاکھ لاکھ منتیں کیں، میں نے ایک بھی نہیں سُنی، ٹیلی فون کئے۔ اماں کی خوشامد کی، خود آئے مگر میں نے اُن سے بات بھی نہیں کی، اماں نے بھی بڑی سفارش کی، میں نے کہا اس موئے سیٹھ کے لئے کچھ کہو گی تو زہر کھاؤں گی، اتنے میں ٹیلی فون آیا کہ سیٹھ صاحب آ رہے ہیں۔ اماں ان کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگیں۔ اور میں چپکے سے ادھر کھسک آئی۔

یہ سُنکر مہاراجہ صاحب نے ایک پُرزور قہقہہ لگایا اور فرمایا "بہت اچھا کیا، بہت اچھا کیا .... مگر پھر تم افسردہ سی کیوں تھیں؟"

"افسردہ ہونے کی بات نہیں ہے؟ ہزار روپیہ مہینہ کی نوکری گئی انعام اکرام جو ملا کرتا تھا، وہ گیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اماں خفا ہو گئیں اسے آپ کچھ سمجھتے ہی نہیں؟"

(سر پر ہاتھ رکھ کر) "نہیں نہیں، تم گھبراؤ مت! سٹوڈیو ایک

گالی دیکر) کو تم نے چھوڑ دیا، بہت اچھا کیا، رہ گیا تمہاری ماں کا معاملہ، سو تم بے فکر رہو۔ میں انہیں راضی کر لوں گا "

"اب تو ار پریشان صورت بناکر) میں گھر بھی واپس نہیں جاسکتی "

"تو ضرورت ہی کیا ہے، یہیں آرام کرو"۔

"تاکہ پھر اماں صورت بھی نہ دیکھیں"۔

"صورت کیوں نہیں دیکھیں گی؛ ان کو رضامند کرنے کا میں ذمہ دار ہوں"۔

(مسکرا کر) میں بھی تو سنوں وہ ترکیب؟"

"روپیہ"۔

"اے واہ! یہ بھی کوئی ترکیب ہوئی!"

"یہی تو اصل ترکیب ہے!"

اس گفتگو سے مس رُوپا مطمئن ہو گئیں۔ اطمینان اور دل جمعی سے گھل مل کر باتیں کرنے لگیں، رات کی سیاہی تاریک تر ہو رہی تھی، پانی اب بھی رم جھم برس رہا تھا، فضا میں ایک خنکی سی پیدا ہو چکی تھی۔

مہاراجہ نے رُوپا سے کہا:۔

"ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں "

"کیا مطلب؟"

"چاند کی روشنی اور بجلی کی روشنی ساتھ ساتھ نہیں چل سکتیں"۔

"اس اندھیری رات میں چاند کہاں؟"

"دکھاؤں؟"

"ضرور دکھایئے، میں بھی تو آپ کا کرشمہ دیکھوں؟"

"ابھی دکھاتا ہوں، تمہیں قائل ہونا پڑے گا"

"دیکھ لوں گی تو ضرور قائل ہو جاؤں گی"۔

. . . مہاراجہ صوفے پر سے آہستہ آہستہ اُٹھے، آہستہ آہستہ چلے، کچھ دُور چل کر ٹھٹھکے:۔

"ہوشیار اب میں اپنا کرشمہ دکھاتا ہوں"۔

"ضرور دکھایئے"۔

دفعتًہ مہاراجہ نے ہاتھ اوپر اُٹھایا، سویچ دبایا، اور روشنی گل کر دی

رُوپا نے کہا:۔

"یہ کیا؟"

"جو میں نے کہا تھا"

"آپ نے چاند کہاں دکھایا؟"

"ایں! تم نے اب تک نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو!"

. . . مہاراجہ قریب آئے، رُوپا کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ میں لی، اُسے اوپر اُٹھایا اور فرمایا:-

"دیکھا؟"

(رُوپا نے کوئی مزاحمت نہیں کی، صرف ایک ہلکے قہقہہ سے، مہاراجہ کی ندرتِ خیال کی داد دی، مہاراجہ کی اس حوصلہ افزائی نے ہمت بندھائی اور وہ چاند کا ہالہ بن گئے!)

رات جے ہو کی کوٹھی میں بسر ہوئی، صبح ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر، پارٹی سورج پور پیلیس پہنچی - کوئی گیارہ بجے کے قریب ٹیلی فون آیا، رُوپا ہمک کر ٹیلی فون پر پہنچی -

"ہلو!"

جواب دیئے بغیر اس نے اشارہ سے مہاراجہ کو بلایا، وہ آئے تو "آ ماں ہیں" کہہ کر رسیور اُن کے ہاتھ میں دیا، اور خود الگ کھڑی ہو گئی -

"ہلو! ہلو!"

"جی ہاں میں سورج پور پیلیس سے بول رہا ہوں"۔

"میں، ہی مہاراجہ ہوں"

"رُوپا یہاں ہیں"۔

RAJA LIBRARY. Tannery Road, BIHAR COLONY, KARACHI.

"ایں، آپ روتی کیوں ہیں؟ وہ بہت آرام سے ہیں"

"آپ کو یقیناً صدمہ پہنچا، لیکن رُوپا کو بھی آپ کی خفگی کا کم صدمہ نہیں ہے"

"میں گاڑی بھیجتا ہوں آپ تھوڑی کے لئے یہاں آجایئے کچھ گفتگو کرنی ہے"

یہ کہہ کر مہاراجہ نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ ملازم کو حکم دیا کہ وہ کار لے کر جائے اور رُوپا کی ماں کو لے آئے، ملازم کے جانے کے بعد رُوپا نے پوچھا:۔

"کیا کہہ رہی تھیں"؟

"بہت خفا ہیں"

"پھر اب"؟

"اب کیا؟ وہ آتی ہیں راضی ہو کر جائیں گی"

"میری ہمت تو اُن سے ملنے کی نہیں پڑے گی"

"تم نہ ملنا"

"اپنی اماں سے نہ ملوں"

"تم ہی ملنے سے کترا رہی ہو"۔

"میں تو ان کی خفگی سے ڈر رہی ہوں"۔

RAJA LIBRARY
BIHAR COLONY, KARACHI

"اسی لئے تو کہتا ہوں ، ابھی نہ ملو۔"

" دیکھئے ، آپ انہیں خوش کر لیجئے گا۔"

"تم مطمئن رہو ، یہ میرا ذمہ۔"

. تھوڑی دیر کے بعد اطلاع ملی کہ روپا کی اماں آ گئیں ، روپا ایک بغلی کمرہ میں خاموشی سے بیٹھ گئی ! بڑی بی روتی پیٹتی اندر داخل ہوتیں ۔

"ہائے میری لڑکی - اس موئی نے ناک کٹا دی مجھے بھی ذلیل کیا خود بھی ذلیل ہوئی ۔"

"کیا بات ہے ؟ آئیے ، بیٹھئے ، کہئے تو کیا بات ہے ۔"

"کیا بات ہوئی مہاراجہ صاحب ! روپا نے اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ۔"

"کچھ کہئے تو ۔"

"صاحبزادی نے طیش میں آ کر نوکری چھوڑ دی اور سیٹھ صاحب سے بھی لڑ آئیں !"

"تو کیا غضب ہو گیا ؟ اچھا ہوا ۔"

یہ ٹھسے اسی نوکری پر تو تھے ، اب کیا ہوگا ؟ ان کی ضدیں کہاں سے پوری ہوں گی ؟

.... (کچھ دیر رُک کر) ... یہ نوکری تھی ؟ ..... مہینہ میں دو چار دن کمپنی چلی گئیں ، پہلی تاریخ کو ہزار روپیہ گنا لائیں ، پھر انعام واکرام جدا"

..... ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھیں کہ مہاراجہ نے کہا :۔

(غصہ میں چیخ کر) "رُوپا اس قابل ہے کہ اس بدمعاش کی لونڈی بنے تمہیں شرم نہیں آتی ؟ ایک ہزار روپیہ پر رُوپا کو بیچتی ہو"

"سرکار ......"

"میں کچھ نہیں سُننا چاہتا ، تمہیں جتنے روپے کی ضرورت ہو مجھ سے لو ، رُوپا کو کمپنی سے ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا ، میں دو ہزار دوں گا تین ہزار دوں گا ۔ مگر اب رُوپا اس بدمعاش کمپنی میں نہیں جا سکتی وہ میرے پاس رہے گی ۔ اگر تمہیں اس پر کچھ اعتراض ہو تو کہو !"

"سرکار مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے ؟"

"بس اب رُوپا پر مت خفا ہونا"

"نہیں سرکار میں خفا نہیں ہوں گی"

مہاراجہ صاحب اُٹھ کر اس کمرے میں گئے جہاں رُوپا بیٹھی ہوئی تھی ۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لائے ، اور بڑی بی کے سامنے لا کر اسے کھڑا کر دیا ..."

"یہ ہیں، آپ کی رُوپا"

. . . . ماں نے بیٹی کو گلے سے لگایا، کچھ دیر تک دونوں کی آنکھیں نم آلود رہیں پھر دونوں الگ الگ بیٹھ گئیں!

مہاراجہ نے تین ہزار روپیہ ماہوار کی تنخواہ رُوپا کی مقرر کر دی بڑی بڑی کو یکمشت ۲۵ ہزار روپیہ کی رقم عطا کرنے کا حکم نافذ فرمایا۔ اور اپنے کمرہ میں چلے گئے ۔

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۶)

سینما ہاؤس میں!

آج مہاراجہ صاحب رام کوٹ کے اعزاز میں سر فیروز جی رستم
کی طرف سے ایک گارڈن پارٹی تھی، شہر کے معززین کارپوریشن کے
اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے ارکان، وزراءِ حکومت عدالت کے جج
بڑی تجارتی فرموں کے مالک اور منیجر بڑے بڑے بنکوں کے ڈا

اور ایجنٹ سب ہی موجود تھے۔ مہاراجہ صاحب سورج پور کو بھی سر فیروز نے خاص طور پر مدعو کیا تھا، وہ بھی تشریف لے گئے۔ جب وہ پارٹی میں پہنچے تو تقریباً سب مہمان پہنچ چکے تھے، بینڈ اپنی سحر طراز آواز سے حاضرین پر کیف و سرور کا عالم طاری کئے ہوئے تھا، دروازہ پر سر فیروز نے مہاراجہ صاحب کا لپک کر استقبال کیا، اُن کے پاس ایک نوخیز خوبصورت، طرح دار اور بے حد سحر طراز لڑکی کھڑی تھی، سر فیروز نے مہاراجہ سے کہا:-

"یہ ہے میری لڑکی مس فیروز رستم۔"

مہاراجہ نے بہت گرم جوشی سے مصافحہ کیا، مس فیروز بڑے اخلاق و تپاک سے مہاراجہ کو لے کر آگے بڑھی، سبزہ زار کے ایک گوشہ میں ایک کرسی پر مس فیروز رستم بھی بیٹھ گئیں؛ اب باتیں شروع ہوئیں

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" مہاراجہ نے کہا۔

"میں بھی اس خوش بختی پر نازاں ہوں" مس فیروز رستم نے کہا،

"آپ کے والد کے اثر و رسوخ کا میں تو آج قائل ہو گیا۔"

"بجا ارشاد!"

"ہاں دیکھئے نا" شہر کی کون بڑی ہستی ہے جو کھنچی نہ چلی آئی ہو؛ یہ ان کا حسن اخلاق ہے جس سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے، سیٹھ صاحب

میرے خاص کرم فرماؤں میں ہیں، میں جب بمبئی آتا ہوں ان سے ضرور
ملتا ہوں، وہ بھی میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ تعجب ہے اس سے پہلے
آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

میں نے یہاں سینٹ زیویرس کالج میں بی۔اے پاس کیا، پھر
لندن چلی گئی۔ وہاں دو تین سال تک رہی، ابھی ایک ہفتہ ہوا واپس
آئی ہوں۔"

"خوب، بہت خوب، آپ نے تو تعلیم کے انتہائی مدارج طے کر لئے"

"ارادہ تو ابھی اور تھا مگر۔۔۔۔"

"مگر؟"

"والد صاحب نے بلا لیا۔"

"خیر اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔"

اتنے میں خود سیٹھ صاحب تشریف لے آئے۔ مہاراجہ نے نیم ایستادہ
ہو کر ان کا استقبال کیا، سیٹھ صاحب بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"بیٹی تم نے مہاراجہ صاحب کی کچھ بھی خاطر نہیں کی؟"

"سیٹھ صاحب، میں ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور یہ معلوم
کر کے تو اور مسرت ہوئی، اعلیٰ تعلیم کے زیور سے بھی یہ آراستہ ہیں۔"

"حضور اس چھوکری کو پڑھنے کا تو عشق ہے، وہ تو کہئے

نے اصرار کر کے واپس بُلا لیا، ورنہ صاحبزادی تو ابھی اور تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں ۔"

"تو آپ کو اس راہ میں نہیں حائل ہونا چاہیئے تھا، پڑھنے دیتے، آپ کا کیا حرج تھا؟"

"میرا حرج ہی نہیں تھا؛ یہی ایک لڑکی ہے لڑکا ہے تو یہ، لڑکی ہے تو یہ"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"میں اب بوڑھا ہوا، اب بھی اگر یہ کاروبار نہ دیکھیں گی تو کب دیکھیں گی؟"

"اس نقطۂ نظر سے تو آپ نے اچھا کیا بُلا لیا، (مسکرا کر)" "آپ بھی ابّا کی سی کہنے لگے۔"

(ہنس کر)" میں نے تو بھئی ایمان کی کہی ہے۔"

پارٹی کا وقت اسی طرح، دلچسپ باتوں اور پر لطف گھاتوں میں کٹا، چند روز کے بعد سرفیروز نے مہاراجہ صاحب کی خاص طور پر اپنے ہاں دعوت کی، اصل بات یہ تھی کہ وہ سورج پور میں بعض چیزوں کا ٹھیکہ لینا چاہتے تھے، اس لئے اُن کی مرضی تھی کہ جہاں تک ہو سکے مہاراجہ صاحب کو پرچائیں، ان کے دوست اور بہی خواہ بن کر اس سے زیادہ سے زیادہ

نفع کمائیں، مہاراجہ صاحب بھی سیٹھ صاحب سے زیادہ مانوس ہو چلے تھے، اس لئے وہ ان کی دعوتوں کو بڑے شوق سے قبول کرتے تھے اور خود بھی کبھی کبھی انہیں اور ان کی صاحبزادی کو اپنے ہاں، لنچ یا ڈنر پر مدعو کرتے رہتے تھے،

ایک روز مہاراجہ نے ان دونوں کو اپنے ہاں ڈنر پر مدعو کیا، وقت مقررہ پر مس فیروز رستم تشریف لے آئیں، مگر ان کے والد نہیں تشریف لائے۔

مہاراجہ نے پوچھا:-

سیٹھ صاحب کہاں رہ گئے؟

"وہ بھی میرے ساتھ ہی آ رہے تھے، پونہ سے ٹیلیفون پر مینجر نے کاروبار کے سلسلہ میں انہیں فوراً وہاں طلب کیا۔ میں ادھر چلی آئی، اور وہ موٹر پر ابھی ابھی پونہ روانہ ہو گئے ....
مجھے ہدایت کرتے گئے ہیں کہ میں ان کی جانب سے بہت بہت معذرت آپ سے کروں"

"کاروبار کے سلسلے میں جانا تھا تو خوب کیا، چلے گئے، میں ان کا نقصان تو نہیں چاہتا، ہاں آپ کی اس نوازش کا شکر گذار ہوں"

"میں نے کیا نوازش کی؟"

"یہی کہ آپ آگئیں"

"واہ نوازش تو آپ کی ہے کہ آپ ہم لوگوں کو یاد فرماتے رہتے ہیں!

مہاراجہ صاحب جواب دیتے بغیر مسکراتے ہوئے اُٹھے، اور ریڈیو سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے، اتفاق سے اس وقت نیو تھیٹرز کی کسی فلم کا ایک ریکارڈ بجایا جا رہا تھا، مہاراجہ صاحب اپنی نشست پر آ کر بیٹھ گئے اور محویت کے عالم میں گانا سُننے لگے، مس فیروزرستم بھی بڑے انہماک سے اسی کام میں معروف تھیں۔ جب ریکارڈ ختم ہو گیا، تو مہاراجہ نے ریڈیو بند کر دیا، اور فرمایا،

"اب اس کے بعد کچھ سُننا بے کار ہے"

"بات تو یہی ہے"

نیو تھیٹرز کی موسیقی تمہیں بھی پسند ہے؟"

"بہت زیادہ موسیقی ہی نہیں اس کا سب کچھ"

واقعہ یہ ہے کہ ملک میں یہی ایک کمپنی ہے، جو شستہ، شائستہ اور قابلِ دید فلمیں تیار کرتی ہے"

"میں تو ہمیشہ نیو تھیٹرز کی فلمیں دیکھتی ہوں، ہندوستانی کمپنیوں میں

مجھے یہی پسند ہے"

"اس کی تازہ فلم تم نے دیکھی؟"

"کون سی فلم؟"

"نام تو مجھے یاد نہیں، ابھی کل سے شروع ہوئی ہے"

"ودیاپتی تو نہیں؟"

"شاید وہی اکیسی ہے؟"

"اچھی ہی ہوگی"۔

"یقیناً قابلِ دید ہوگی"

"میں تو آج جانے والی تھی"

"پھر کیوں نہیں گئیں؟"

"والد صاحب تو پونہ چلے گئے"۔

"تو چلو نا ہم بھی چلتے ہیں"

"ضرور چلیئے"۔

فوراً ٹیلی فون پر نشستیں ریزرو کرائی گئیں، اور مہاراجہ صاحب مع اپنی پارٹی کے تماشہ دیکھنے روانہ ہوگئے ایک بکس مخصوص کرایا گیا تھا - اس میں تو مہاراجہ صاحب اور مس فیروز رستم رونق افروز ہوئے، بالکنی پر مہاراجہ کے اسٹاف نے قبضہ

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

کرلیا، چند لمحوں کے بعد روشنی گل ہوئی، اور پردہ سیمیں پر، بولتی ہوئی باتیں کرتی ہوئی چہکتی ہوئی، انسانی صورتیں جلوہ گر ہوگئیں۔

اس فلم میں ڈائرکٹر نے، انسانی نفسیات کا اتنا مکمل مرقع پیش کیا تھا کہ فرنگی فلمیں بھی اس کے آگے گرد تھیں، جذبات کا اتار چڑھاؤ، فضا اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ، جذبات کی نوعیت میں تبدیلی نفس کی چھپی ہوئی کمزوریاں ملمع کی ہوئی انسانی خودغرضی، محبت میں عورت کا استقلال، ثابت قدمی، وفاداری، دوسری طرف ایک کوہ وقار شخص کی بے پناہ محبت، لیکن اس کی مراد نہ کمزوریاں مجبورانہ ٹھوکریں، دل پر سب کچھ گذرنا، قیامت کا ٹوٹنا، لیکن زبان سے اُف نہ کرنا، چہرہ بشرہ سے کسی جذبہ کا اظہار نہ ہونے دینا، اتنے مشکل، اور جان سوز جذبات عادات اور خصائل کی فلم بندی آسان نہیں تھی، لیکن ڈائرکٹر کا یہ کمال تھا کہ تصویروں کی ہر حرکت بولتی ہوئی نظر آرہی تھی، ہر بول اپنی جگہ پر ایک تراشا ترشایا نگینہ تھا، ہر جذبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم پر گذر رہا ہے ہر واقعہ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ہماری ہی داستانِ حیات کا کوئی ٹکڑا ہے پورے افسانے پر رشک ہوتا تھا کہ ہماری زندگی اسی معیاریا افسانہ کی مصداق کیوں نہ ہوئی؟

. . . . فلم عام پسند نہیں تھی، خواص پسند تھی، اوسط درجہ

سکے لوگ تو اس کے مقصد، اس کی کنہ، اور اس کی تہہ کو پہنچ بھی نہیں سکتے تھے، لیکن عالم یہ تھا کہ عام اور خاص سب محوِ حیرت بنے ہوئے تماشہ دیکھ رہے تھے، کسی کو سر پیر کا ہوش نہیں تھا، جو خواص تھے وہ جذبات اور نفسیات کے نکتے حل کر رہے تھے، اور سر دھن رہے تھے، جو عوام تھے، وہ مناظر کی خوبی، زبان کی شستگی، موسیقی کی دلآویزی اور نغمۂ و رقص کے کمال فن میں محو تھے۔ ان کی دُنیا اسی سے آباد تھی،

مِس فیروزہ رستم کا یہ حال تھا جیسے کُرسی پر کوئی مجسمہ بٹھا دیا گیا ہو، نہ حرکت نہ جنبش! مہاراجہ صاحب اگرچہ اندھیرے میں بھی دزدیدہ نگاہی سے نہیں چوکتے تھے۔ لیکن وہ بھی ہمہ تن محو بیٹھے ہوئے تھے، ایک طرف مِس فیروزہ کی قربت انہیں پیہم دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ دُوسری جانب فلم کی جاذبیت اور دل کشی بار باراُن کی نظروں کو پردۂ سیمیں پر متوجہ کر دیتی تھیں۔ ع

نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد!

کا معاملہ درپیش تھا۔

ہر دو نظارے اُن کے لئے دعوتِ کیف و سرور تھے اور بے چارے کسی سے بھی جی بھر کے لطف اندوز اور محظوظ نہیں ہو پاتے تھے۔

انٹرول ہوا تیز روشنی کے بڑے بڑے قمقمے پھر روشن ہو گئے

جس وسیع ہال میں ابھی سناٹا چھایا ہوا تھا، اب وہاں پان سگریٹ چائے سوڈا لیمن کا دَور چلنے لگا۔ اب مہاراجہ کو گفتگو کا موقع ملا، انہوں نے کہا:۔

"فلم تو خوب ہے!"

"صرف خوب، بہت خوب، بے انتہا خوب!"

"تمہیں پسند آئی؟"

"اگر آج میں نہ آتی تو اپنی بدقسمتی پر مجھے افسوس ہوتا۔"

"میں بھی بہت متاثر ہوا۔"

"آپ نے یہ بھی غور کیا کہ انسانی نفسیات کی کتنی کامیاب تصویر کشی ہے؛"

"واقعی ڈائرکٹر نے کمال کر دیا۔"

"حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ایسے ایسے قابل فن ڈائرکٹر بھی ہیں"

"میں تو سمجھتا تھا، انگریزی فلموں کا مقابلہ ہندوستانی فلمیں ابھی عرصہ تک نہیں کر سکیں گی، لیکن آج مجھے، اپنی رائے بدلنی پڑی۔"

"میں تو کہتی ہوں، اس فلم کو ہم فخر کے ساتھ غیر ملکی فلموں کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔"

"بے شک"!

.... انٹرول ختم ہوا، روشنی پھر گل ہوئی اور پردہ سیمیں پر انسانی

پتلے پھر چلنے پھرنے لگے ۔ لوگ پھر آپس کی باتیں چھوڑ، تماشہ دیکھنے میں محو ہو گئے ۔

مہاراجہ نے آہستہ سے اپنی کرسی اور آگے بڑھائی ، اور اُسے مس فیروز کی کرسی سے بالکل ملا دیا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اطمینان سے بیٹھ کر انھوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ، اسے دبایا ، اس نے کوئی مدافعت نہیں کی ، مہاراجہ نے آہستہ سے ، سرگوشی کے لہجہ میں کہا ،

" مس ۔ ۔ ۔ فیروز

" کہیئے " !

" ادھر دیکھو "

" اور تماشا نہ دیکھوں ؟ "

" سنو تو "

" فرمائیے نا "

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

مہاراجہ نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے کر چاہا کہ اسے اپنے آغوش میں لے لیں ! بجلی کی سی سرعت سے اس نے اپنا داہنا ہاتھ چھڑایا اور پوری طاقت سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مہاراجہ کے منہ پر ایک چانٹا رسید کیا ، مہاراجہ صاحب مع کرسی کے دھم سے نیچے گرے ، اور مس فیروز باہر نکلیں ، اتفاق سے پاس ہی کے کیبن میں سینما ہاؤس کا مالک ، اپنے

چند ارکانِ خاندان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اس نے جو یہ دھماچوکڑی سنی جلدی سے اُدھر آیا، بجلی کا سوئچ دبایا، روشنی ہوگئی۔ مِس فیروز تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ غصّہ میں بھری ہوئی باہر نکل رہی تھیں۔ مہاراجہ صاحب کرسی کے پھندے سے جدوجہد کر کے باہر نکل چکے تھے، لیکن ابھی فرش زمین سے اُٹھ نہیں پائے تھے، روشنی جو ہوئی تو مِس فیروز ٹھٹھکیں، مہاراجہ صاحب سنبھلے۔ سینما کا مالک ایک جہاں دیدہ، گرگ باراں دیدہ، کار آزمودہ اور سنجیدہ آدمی تھا، ایک ہی نظر میں اُس نے سب کچھ بھانپ لیا بڑے اخلاق سے اُس نے مِس فیروز سے پوچھا:۔

"کیا ہوا مِس صاحبہ؟"

"اسی بدمعاش سے پوچھو"

یہ کہا اور برہمی کے عالم میں اپنی زلفیں سنوارتی ہوئی باہر چلی گئیں! باکس کی روشنی پھر گل کر دی گئی، مالک اندر آیا، اور پاس کی کرسی پر، مہاراجہ کے قریب بیٹھ گیا، —— اس نے کہا:۔

"حضور میں بالکل نہیں سمجھا، کیا معاملہ ہے؟"

"جو کچھ ہوا ہو گیا، اب اس قصّے کو جانے دیجئے۔"

"لیکن سرکار، اس طرح تو ہمارا ہاؤس بدنام ہو جائے گا۔"

"آپ کا مطلب؟"

"میں چاہتا ہوں، پولیس کو اطلاع دے دوں، تاہم بدنامی سے محفوظ رہیں، وہ مس صاحبہ کا بیان لے کر کارروائی کرتی رہے گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سرکار! میرے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں"۔

"تمہیں اس خاموشی کا معاوضہ ملے گا۔"

مہاراجہ صاحب نے اپنے پرائیویٹ سکرٹری کو بلوایا، اُسے ہدایت کی کہ اسٹاف کے لوگ بدستور سینما دیکھتے رہیں؛

"تم میرے ساتھ چلو۔"

مہاراجہ صاحب مع اپنے سکرٹری اور مالک سینما کے نیچے اُترے۔ انہوں نے کچھ چپکے سے سکرٹری سے کہا، اور اپنی موٹر میں جاکر بیٹھ گئے۔

سکرٹری صاحب نے مالک کو سمجھایا بجھایا، اُس سے خاموش رہنے کا عہد لیا، اور چھ ہزار روپیہ کے نوٹ، اس کی جیب میں ڈال کر مہاراجہ کے پاس آگئے۔

موٹر سورج پور پیلیس روانہ ہوگئی، راستہ میں نہ مہاراجہ نے کچھ کہا، نہ سکرٹری صاحب کچھ بولے۔

باب
(۷)
مہاراجہ کالج فار گرلز

مہاراجہ صاحب نوجوان تھے، ان کی اولوالعزمی ہر روز اپنے لئے نئی نئی راہیں نکالتی رہتی تھی، وہ ایک پوری اسٹیٹ کے مالک تھے جس میں مجلس قانون ساز بھی تھی، اعلےٰ حکام بھی تھے، تاجر اور سرمایہ دار بھی تھے، خواندہ اور تعلیم یافتہ بھی تھے، جہاندیدہ اور تجربہ کار بھی تھے، لیکن مہاراجہ کی شخصیت، ان سب پر بالا تھی۔ ان کے ارشاد کے سامنے، تمام قوانین، تمام

حکام، تمام وزراء، تمام اکابر، مجال دم زدن نہیں رکھتے تھے، جس
چیز سے انہیں دلچسپی ہوجاتی، سب کو اس سے دلچسپی لینا پڑتی، جس
چیز سے وہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتے، سب اس کے خلاف نفرت و حقارت
کا اظہار کرنے لگتے۔

جب تک مہاراجہ تعلیم سے دلچسپی نہیں لیتے تھے، ریاست کے
حکام و عمال بھی، اس مد پر روپیہ صرف کرنا بے کار سمجھتے تھے، اب مہاراجہ کو
تعلیم سے شغف ہوا۔ تو تعلیم کی اہمیت و افادیت کے ترانے ہر شخص کی زبان
پر تھے، وظائف کی تعداد بڑھا دی گئی، اور ہر طرح ترغیب و تحریص سے کام
لے کر تعلیم کو عام کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔

یوں تو سورج پور میں کئی مدرسہ تھے، ایک کالج بھی تھا جس میں مخلوط تعلیم
تھی، اب مہاراجہ صاحب کو خیال ہوا کہ لڑکیوں کے لئے خاص طور پر ایک
کالج کھولا جائے، جس میں صرف لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ اس کے معنی یہ نہ
تھے کہ مخلوط تعلیم کا کالج بند کر دیا جائے گا، مطلب یہ تھا کہ اگر اس میں گنجائش
نہ ہو یا بعض والدین، اپنی لڑکیوں کو مخلوط کالج میں تعلیم نہ دلانا چاہتے ہوں
تو وہ اس کالج میں بے وسواس اپنی لڑکیوں کو بھیجکر انہیں زیور تعلیم سے
آراستہ کر سکیں۔

موجودہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ہندوستان ابھی بہت پیچھے

ہے، اور ریاستیں اپنی پس ماندگی کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہیں، قدامت اور جہالت، اور توہم پرستی ان کا طغرائے امتیاز ہے۔

سورج پور میں صرف چند گھرانے ایسے تھے، جو لڑکیوں کو مخلوط کالج میں بھیجنا معیوب نہیں سمجھتے تھے، اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو اس طرز کو سخت ناپسند کرتے تھے، اپنی لڑکیوں کو جاہل رکھنا، یا کم پڑھانا، انہیں گوارا تھا، لیکن وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے، کہ ان کی لڑکیاں لڑکوں کے پہلو بہ پہلو بیٹھ کر تعلیم حاصل کریں، اب مہاراجہ صاحب نے، خاص طور پر لڑکیوں کے لئے جو ایک کالج کی بنیاد ڈالی، تو اچھے شریف اور معزز و ممتاز گھرانوں کی لڑکیاں، جوق در جوق آ آ کر داخل ہونے لگیں۔ کالج کی اس کامیابی سے مہاراجہ صاحب بہت مسرور تھے، انہیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ کالج اس قدر جلد ترقی کر جائے گا اور اسے اتنی ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے گی!

کالج کی پرنسپل مس ڈکنس مقرر ہوئیں۔ یہ ایک اینگلو انڈین خاتون تھیں کیمبرج سے، ایم۔ اے کی سند حاصل کر چکی تھیں۔ تعلیمات سے انہیں خاص دلچسپی تھی، عمر کوئی ۴۴، ۴۵ کے لگ بھگ ہو گی، مگر شادی اب تک نہیں کی تھی اور نہ آئندہ کرنے کا خیال تھا، مشہور تھا کہ ان کی یہ خاموشی اور تنہائی کی زندگی عنفوان شباب کے کسی رومان سے وابستہ ہے، کہتے ہیں ایک انگریز سے انہیں محبت تھی۔ تعلقات بڑھے اور طے ہو گیا کہ دونوں رشتۂ ازدواج

میں منسلک ہوجائیں، اتنے میں جنگِ عظیم چھڑ گئی اور وہ انگریز فوج میں
بھرتی ہوکر محاذ جنگ پر روانہ ہوگیا - اور وہیں کام آگیا - اس کی وفات
پر اتنی دل برداشتہ اور غمگین ہوئیں کہ اُنہوں نے طے کرلیا زندگی بھر کنواری
رہیں گی - چنانچہ اپنا عہد وفا یہ اب تک نباہے چلی جارہی تھیں -

مس ڈکنسن بہت خوش اخلاق، سلیقہ شعار، اور مہر و محبت کی خاطر
لڑکیوں کے ساتھ نظم اور ضابطہ میں تو بہت سخت تھیں، لیکن ویسے ان کا
ایک شفیق ماں کا سا ہوتا تھا، متعدد لڑکیوں کو وہ اپنی جیب خاص سے امداد
دیتی تھیں، کالج کے اوقات کے علاوہ بھی اپنے وقت کا بڑا حصّہ وہ اعلیٰ
امتحانات کے لئے لڑکیوں کو تیار کرنے میں صرف کرتی تھیں، اس برتاؤ کا نتیجہ
یہ تھا کہ لڑکیاں بھی اُن سے بہت زیادہ محبّت کرتی تھیں - ان کے سر میں کبھی
بھی ہوجاتا تو لڑکیاں بے قرار ہوجاتیں، درحقیقت کالج کی شہرت نیکنامی
اور ہر دلعزیزی میں مس ڈکنسن کا بہت بڑا حصّہ تھا -

مہاراجہ صاحب اس کالج سے بہت دلچسپی لیتے تھے، اکثر ایسا ہوتا
مہمات ملکی - اور امور سلطنت سے فارغ ہوکر، موٹر میں بیٹھتے، خود ہی اسے
ڈرائو کرتے اور سیدھے کالج پہنچ جاتے، مس ڈکنسن انہیں ہاتھوں
لیتیں، کالج کی سیر کراتیں، اُستانیوں سے ملاقات کراتیں ایک ایک درجہ
میں لے جاکر طرزِ تعلیم کا مشاہدہ کراتیں، پھر اپنے دفتر میں لاکر اعزاز کے

ساتھ انہیں بٹھاتیں اور کالج کی ضروریات، مشکلات، اور معاملات پر بحث وگفتگو کرتیں۔ مہاراجہ صاحب بکمال خندہ پیشانی سب کچھ سُنتے اور مناسب جواب دیتے جاتے۔ کالج کی ترقی کی خبریں ان کے لئے بہت زیادہ مسرت انگیز ہوتیں۔

ایک روز مہاراجہ صاحب حسبِ معمول کالج تشریف لائے، دفتر میں میں بیٹھے اور مس ڈکنسن سے کہنے لگے،

"میں اپنے کالج کی لڑکیوں کی دعوت کرنا چاہتا ہوں"

"سرکار کی بندہ نوازی ہے"۔

"تو آپ انہیں محل میں بھیج دیں گی؟"

"جب فرمایئے سب حاضر ہوجائیں گی"۔

"تو آج ہی شام کو"۔

"بہت ہی خوب، آج شام کو سہی"۔

"کالج میں کتنی لڑکیاں ہیں؟"

"درج رجسٹر تو ۱۲۰ ہیں لیکن حاضری علی العموم ۹۵، ۱۰۰ رہتی ہے۔

"تو آپ سب کو اطلاع دے دیجئے"۔

"بہت بہتر! میں ابھی سب سے کہے دیتی ہوں"۔

"سات بجے شام تک سب پہنچ جائیں"۔

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"ایسا ہی ہوگا سرکار!"

یہ فرما کے مہاراجہ صاحب تو رخصت ہوگئے، اور مس ڈکنسن نے مہاراجہ صاحب کی دعوت کی اطلاع استانیوں اور معلمات کے ذریعہ سب لڑکیوں کو کردی . . . . شام کو اسٹیٹ کی موٹریں آگئیں، اور کالج ہی سے سب لڑکیاں شاہی محل کی طرف روانہ ہوگئیں۔ استانیوں اور مس ڈکنسن کو چونکہ مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے یہ نہیں گئیں،

مہاراجہ صاحب نے بہت پُر تکلف دعوت کا انتظام کیا تھا، شاہی محل میں کمی ہی کس چیز کی تھی، ایک بہت بڑے حال میں سب لڑکیاں صوفوں اور کرسیوں پر بٹھائی گئیں، ہال شیشہ آلات سے سجا ہوا تھا قیمتی قیمتی جھاڑ اور فانوس لٹک رہے تھے۔ چھت پر صندل کی لکڑی کی چھت گیری منڈھی ہوئی تھی، جس میں سنہرے حلقوں کے اندر آئینے جڑے ہوئے تھے۔ فرش پر، ایران کے اعلیٰ قالین اور غالیچے بچھے ہوئے تھے دیواروں پر مختلف جانوروں کی کھوپڑیاں روغن کی ہوئی آویزاں تھیں، ان میں ایک شیر ببر جو اب بھُس بھرے جانے کے بعد، صرف "شیر قالین" ہی رہ گیا تھا، اپنی گذشتہ ہیبت اور جبروت کی یاد تازہ کر رہا تھا۔

سب لڑکیاں ایک طرف قرینہ سے بیٹھ گئیں، تھوڑی دیر کے بعد مہاراجہ صاحب بر آمد ہوئے، سب نے سروقد کھڑے ہوکر تعظیم کی رسم

ادا کی، مہاراجہ "بیٹھئے" کہہ کر ایک کرسی پر نشست فرما ہوئے، اُن کے بیٹھتے ہی سب لڑکیاں بھی بیٹھ گئیں، مہاراجہ نے سوال کیا۔

"کہئے آپ اپنی تعلیم سے مطمئن ہیں؟"

"سرکار کے ہم بہت شکر گذار ہیں کہ ہماری تعلیم کا ایسا بہتر انتظام فرمایا گیا۔ ایک لڑکی نے جرأت کر کے جواب دیا، تھوڑی سی دیر تک کالج، تعلیم، ورزش، صحت کے مسائل پر مہاراجہ صاحب لڑکیوں سے گفتگو کرتے رہے اور اتنی ہی دیر میں وہ گھل مل گئے سب کے سب بے تکلف ہو گئے اب تک محفل میں ایک والی ریاست اور اسکی حقیر رعایا کے مابین گفتگو ہو رہی تھی۔ مہاراجہ صاحب بھی اپنے تئیں سنبھالے دیتے تھے۔ اور لڑکیاں بھی کچھ سہمی ہوئی، اور لجائی ہوئی سی نظر آ رہی تھیں، اب مہاراجہ صاحب جو بے تکلف ہوئے تو لڑکیوں کا حجاب بھی ٹوٹ گیا، اور اب یہ محفل، ہم مذاق اور ہم رنگ احباب کی محفل تھی۔ قہقہے، ٹھٹھے، چہچہے اور قصے کہانی کا دور چل رہا تھا۔ کبھی مہاراجہ صاحب کوئی مختصر سی دلچسپ کہانی کہتے اور حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر اسے سنتے، کچھ دیر تک ریڈیو کا شغل بھی رہا اور مختلف قسم کے فنی گانے سنے گئے۔ آخر میں مہاراجہ صاحب نے سوال کیا:۔

"اچھا ایک بات بتاؤ!"

"فرمائیے" ایک شوخ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم میں سب سے اچھا گانا کون گاتی ہے؟"

"سچ سچ بتا دوں؟" اسی لڑکی نے کہا۔

"ہاں، بالکل سچ سچ"۔

"دیکھئے سرکار، میں بالکل سچ سچ بتاتی ہوں"۔

وہی لڑکی پھر بولی۔

ہاں ہاں! بتاؤ نا"

یہ مس...... دُرگا"۔

یہ سنتے ہی سب لڑکیاں مع مہاراجہ صاحب کے زور سے ہنس پڑیں۔ —— اور بےچاری مس دُرگا کچھ جھینپ سی گئیں، اُن کی عمر کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی ہوگی، آبنوس کی طرح تاریک رنگت، تن و توش کے اعتبار سے اگر گوشت و چربی کا ایک اچھا خاصا ٹیلا، مہاراجہ صاحب اپنی ہنسی نہ ضبط کر سکے۔

پھر انہوں نے پوچھا۔

"اور ان کے علاوہ"؟

"بتا دوں، بالکل سچ سچ"۔ وہی لڑکی پھر بولی۔

"نہیں بھائی اب کی جھوٹ جھوٹ بتاؤ"۔ مہاراجہ بولے۔

اس نے ایک لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ان کا، مس کرشنا کا ہمارے کالج میں سب لوہا مانتے ہیں۔"

"واقعی؟"

"سرکار! ایسا اچھا کہ مس ڈکنسن بھی سر دھننے لگتی ہیں۔"

"یہ بات ہے؟" مہاراجہ نے پوچھا "بالکل جھوٹ سرکار" ادھر ہی لڑکی بولی۔
اس پر سرکار بھی ہنس پڑے، اور دوسری طرف لڑکیاں بھی ہنس دیں۔
مہاراجہ نے کہا۔

"مس کرشنا تم اپنا گانا سناؤ۔"

"سرکار مجھے گانا کہاں آتا ہے۔"

"نہیں بھئی اب تو تمہیں گانا ہی پڑے گا۔"

"ان کا، مس مرنالنی کا گانا سنیئے نا، اصل میں سب سے اچھا یہی گاتی ہیں۔"

"ان کا گانا بھی سنیں گے، لیکن پہلے تم سناؤ۔"

اب مس کرشنا کے لئے کوئی چارہ نہ رہا، پہلے تو کچھ کسمسائیں پھر انہوں نے آہستہ سے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا، اور اس کے بعد گانا شروع کیا، مہاراجہ صاحب کرشنا کے گانے سے بہت محظوظ ہوئے پھر مرنالنی سے مخاطب ہوئے۔

"اب تم"۔

"سرکار یہ تو مذاق کرتی ہیں، مجھے گانے سے کیا مطلب؟"

"ابھی امتحان ہو جائے گا، سنا دو تو"

— ایک لڑکی بولی —

"ساز نگی تو منگوائیے سرکار!"

"تم کس لئے بیٹھی ہو؟" مرنالنی نے تیکھے پن سے کہا،

"اچھا اب باتیں ختم، گانا شروع"

. . . . . سب چپ ہو گئے اور مرنالنی نے نغمہ و موسیقی کا شروع کیا، اس کی آواز قیامت ڈھارہی تھی، وہ گارہی تھی، اور سارے محل پر سناٹا چھایا ہوا تھا، بڑی دیر تک وہ گاتی رہی اور مہاراجہ صاحب مدہوش بنے اس کا گانا سنتے رہے۔

پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کھانے کے بعد پھر محفل جمی، مہاراجہ نے مرنالنی سے کہا:-

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"تم بہت خوب گاتی ہو"

"نوازش ہے سرکار"

"کہاں سیکھا تم نے یہ گانا؟"

"کچھ لکھنؤ میں، کچھ اپنے وطن بنگال میں"۔

"جب ہی یہ بات ہے! کیوں نہ ہو؟"

تقریباً ۱۲ بجے شب تک یہ محفل جمی رہی اس کے بعد مہاراجہ صاحب کے حسب الحکم لڑکیاں اپنے اپنے گھروں پر پہنچا دی گئیں۔

دوسرے روز مس ڈکنسن نے، دعوت کا حال پوچھا، انہیں معلوم ہو گیا، رات کو کیسی رنگ رلیاں رہیں، وہ بہت جز بز ہوئیں، مگر کچھ نہ کہہ سکیں، وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ مہاراجہ نے ان لڑکیوں کی دعوت کی ہے ان سے تعلیم کے مسئلہ پر گفتگو کریں گے، کچھ کو وظائف مرحمت کریں گے اور رخصت کر دیں گے، جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ سب تو کچھ نہ ہوا، البتہ نغمہ و موسیقی کی نمائش ہوئی۔ داستان سرائی کے مظاہرے ہوئے، لطف اور تفریح کی مجلس جمی، تو انہیں تکلیف ہوئی، اینگلو انڈین ہونے کے باوجود کچھ قدامت پرست بھی تھیں وہ۔

چند روز کے بعد مس ڈکنسن کو مہاراجہ کا ایک رقعہ ملا، جس میں لکھا تھا کہ وہ شکار کو جا رہے ہیں، ان کی مرضی ہے کہ مرنالنی اور کرشنا بھی ان کے ساتھ جائیں۔ دونوں کو اسی وقت محل روانہ کر دیا جائے۔

مس ڈکنسن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ جواب لکھ دیا۔

"میں ارشاد عالی کی تعمیل سے قاصر ہوں، میں لڑکیوں کے لئے اتنی آزادی نہیں روا رکھتی ہوں، جتنی آپ چاہتے ہیں۔ یہ لڑکیاں میرے

پاس امانت ہیں، میں خیانت نہیں کر سکتی،
میرا خیال ہے کہ سرکار کو زیادہ بلند خیال
ہونا چاہیئے تھا، اگر میرے یہ معروضات
ناگوار ہوئے ہوں، تو میرا استعفا قبول
فرمایا جائے۔

مہاراجہ صاحب کے پاس جب یہ جواب پہنچا تو مارے غصہ کے و
کانپنے لگے فوراً کار پر بیٹھے اور کالج روانہ ہوئے، وہاں پہنچے تو ہو کا عا
تھا، سناٹا چھایا ہوا تھا تمام درجے بند، صرف مس ڈکنسن اپنے دفتر
بیٹھی ہوئی تھیں، مہاراجہ نے پہنچتے ہی کہا۔

آپ نے بہت گستاخانہ جواب دیا، میں اسے ہرگز برداشت نہیں
کر سکتا، مرنا لنی اور کرشنا کہاں ہیں؟ انہیں بلوائیے!"

"میں سمجھ رہی تھی کہ سرکار تشریف لائیں گے، اور انہیں اپنے سا
لے جائیں گے، اس لئے میں نے ادھر آپ کو جواب لکھا، اور ادھر کالج
چھٹی کر دی، مرنالنی اور کرشنا اپنے اپنے گھر پر ہوں گی، آپ چاہیں تو
سے طلب فرمالیں"۔

"مس ڈکنسن! آپ حد سے تجاوز کر رہی ہیں"۔

"میں ریذیڈنٹ صاحب کو بھی اس واقعہ کی اطلاع دے رہی ہوں

"آپ کو ہرگز اس کا حق نہیں ہے"

"سرکار! میں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتی ہوں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں انہیں اطلاع نہ دوں تو میرا استعفا قبول فرمایئے۔

"میں آپ کا استعفا قبول کرتا ہوں"

"شکریہ"

مہاراجہ صاحب برہمی کے عالم میں باہر نکلے، محل پہنچے، اور وزیر تعلیم کو حکم دیا کہ مس ڈکنسن کا استعفا فوراً منظور کر لیا جائے، چونکہ ان سے ایک سال کا معاہدہ تھا، لہٰذا مدت معاہدہ کی پوری تنخواہ دے دی جائے اور ان سے کہہ دیا جائے فوراً سورج پور سے باہر چلی جائیں۔

مس ڈکنسن کے بعد مسز واچا پرنسپل مقرر ہوئیں، اور ترقی کے مدارج بڑی سرعت سے طے کرنے لگیں، اس لئے کہ وہ مہاراجہ کے ہر ارشاد کی فوراً تعمیل کرتی تھیں۔

۔۔۔۔ مرنالنی اور کرشنا ہی نہیں، دوسری لڑکیاں بھی مہاراجہ کی طلب پر فوراً قصر شاہی روانہ کی جاتی تھیں، ان کے وفادارانہ کارنامہ سے مہاراجہ صاحب بے حد خوش تھے۔

باب

(۸)

نذرِ عقیدت

ٹھاکر جوتی پرشاد، ریاست کے قدیم ملازمین میں سے تھے، ۳۰۰ ماہوار تنخواہ ملتی تھی سکھ اور چین سے اپنی زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن پھر بھی وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں تھے، وہ چاہتے تھے ہزاروں روپیہ ماہوار کی آمدنی ہو، ریاست کی طرف سے حسنِ خدمات کے صلے میں جاگیر ملے مہاراجہ صاحب ان کا اعزاز بڑھائیں، انہیں ملازمت کرتے ہوئے

بیس برس کی مدّت گذر چکی تھی - ان کے سکھائے ہوئے لونڈے ، ان کی تربیت دیئے ہوئے چھوکرے ، ان کے ماتحت کام کئے ہوئے لڑکے ، ترقی کر کے بڑے بڑے مراتب پر پہنچ چکے تھے ، اور یہ اب تک گھاس ہی چھیل رہے تھے ، مہاراجہ کی قدر شناسی کا اُن کے دِل پر بہت گہرا اثر تھا ، وہ چاہتے تھے کہ کبھی مہاراجہ صاحب سے ملاقات ہو تو اپنا دل چیر کر رکھدیں ، اور اُنہیں بتائیں کہ اُن کی ناقدر شناسی نے اُن کے دِل کو چھلنی کر دیا ہے ،

خدا کے فضل سے ٹھاکر صاحب کثیر العیال بھی تھے ، تین لڑکیاں چار لڑکے اور ابھی ، خدا کی نئی مخلوق کی آمد کا اُن کے ذریعے سے سلسلہ بند نہیں ہؤا تھا - بڑی دو لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں ، چھوٹی جمنا ابھی کنواری تھی ، ٹھاکر صاحب کو جمنا سے بڑی اُمیدیں تھیں ، تعلیم تو اس کی گھر ہی پر ہوئی تھی ، جدید تہذیب کے طور طریقوں سے بھی کچھ وہ زیادہ واقف نہیں تھی ، لیکن اور حیثیتوں سے وہ ہزاروں میں ایک تھی ، اس کا حسن ، اس کی نزاکت ، اس کی بھولی اور معصوم ادائیں اس کی رکھ رکھاؤ کی باتیں ، یہ چیزیں ایسی تھیں جن پر ٹھاکر صاحب پھولے نہیں سماتے تھے - اُنہیں اُمید تھی وہ جمنا کے لئے ایک ایسا بر تلاش کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے ، جو ریاست میں ایک معزز اور ممتاز حیثیت رکھتا ہو جمنا کو سکھ سے رکھے - اور خود ٹھاکر صاحب بھی جب ضرورت ہو اس سے فائدہ اُٹھائیں ،

ایک روز وہ اپنے خیالات میں غلطان و پیچاں، بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی دھرم پتنی تشریف لائیں، ٹھاکر انہیں دیکھ کر سنبھل بیٹھے اس لئے کہ اُن کا آنا، اکثر و بیشتر کسی تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ہُوا کرتا تھا۔ اُنہوں نے آتے ہی بیٹھنے سے بھی پہلے ٹھاکر صاحب سے فرمایا:۔

"کچھ جمنا کی بھی فکر ہے؟"

"کیا ہُوا اُسے؟"

"ہاں تم تو یہی چاہتے ہو اُسے کچھ ہو جائے"

"تم تو آج لڑنے آئی ہو، میرا مطلب یہ کب تھا؟"

"ہاں میں تو لڑاکا ہوں، لڑاکا نہ ہوتی تو تم جیسے مہاتما کے پلے کیسے پڑتی"

"اچھا بھئی مجھ سے غلطی ہوئی، معاف کرو"

(آبدیدہ ہو کر) پہلے تو جلی کٹی سب سنالو، پھر معافی مانگ لو کیا سہل لٹکا ہے"

"کچھ کہو تو آخر کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"میں کہتی ہوں، جوان جہان لڑکی کو کب تک گھر میں بٹھائے رکھو گے جمنا اب سترہ بھر کے اٹھارہویں برس میں پاؤں رکھ چکی ہے"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں"۔

"جانتے ہو خاک! اس سے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بال بچوں والی ہو چکیں، اور وہ اب تک اس قابل بھی نہیں ہے کہ اس کی کہیں سگائی کر دی جائے۔"

"کیوں نہیں ہے"

"پھر کیوں نہیں کرتے؟"

"گنوں کا آدمی ڈھونڈنا آسان نہیں ہے"

"تو جنم بھر یونہی بیٹھے رہے گی وہ؟"

"یہ میں کب کہتا ہوں؟"

"میرے خیال میں مان سنگھ سے اس کا بیاہ کر دو۔"

"اس لچے سے؟ یہ نہیں ہو سکتا!"

"یہ لو، وہ لچا ہے؟"

"اور کیا، بڑا اہما پرش ہے؟"

"جوانی میں کون لچا نہیں ہوتا؟ تم کون سے دھرم اوتار تھے؟ اپنی بھی تو کہو!"

"میں جمنا کا بیاہ کسی اچھے گھرانے میں، مالدار شریف اور اچھے پڑھے لکھے لڑکے سے کرنا چاہتا ہوں سمجھیں"۔

"ہاں سمجھی، یہ تو تین برس سے سمجھ رہی ہوں"

"تم نے ڈاکٹر تارا چند کا نام سنا ہے"

"سنا کیوں نہیں ہے؟"

"نوجوان ہیں، مالدار ہیں، شریف ہیں"۔

"تو پھر؟"

"میں تو وہاں ڈول ڈال رہا ہوں"

"یہ بھی دیکھ لوں گی"۔

ٹھاکر صاحب اس مباحثہ سے فارغ ہو کر سیدھے اپنے پرانے دوست لکشمی نرائن کے یہاں گئے، اور انہیں لے کر ڈاکٹر تارا چند کے ہاں پہنچے، ڈاکٹر صاحب نے دونوں کی بہت آؤ بھگت کی، خود اپنے کمرہ میں چلے گئے اور ان کے والد متھرا داس ان دونوں کے پاس آ کر براجمان ہو گئے۔

"کہیئے بھائی صاحب کیسا مزاج ہے"۔

متھرا داس نے کہا۔

"بھگوان کی کرپا ہے"۔ ٹھاکر صاحب بولے۔

"ہم آج آپ کا جواب لینے آئے ہیں لکشمی نرائن نے کہا۔

(سر کھجاتے ہوئے) "وہی بیاہ کے معاملے میں نا"

متھرا داس نے کہا۔

"جی ہاں!"

"میں نے تو کہا تھا کہ میں کچھ عرصہ بعد جواب دوں گا"

"لیکن بندہ پرور، اب تو مہینہ کی مدّت گذر گئی"۔

"جی ہاں بات یہ ہے کہ آج کل زمانہ بڑا خراب ہے"۔

"اس میں کیا شک ہے"

"لڑکے ماں باپ کا کہا مانتے ہی نہیں"۔

"ہاں صاحب عجب تماشہ ہے یہی حال ہے ہمارے سرجو کا بھی"۔

"میں نے تارا چند سے کہا تھا"

"پھر انہوں نے کیا کہا"

"صاحبزادے فرماتے ہیں میں تو جہاں میرا جی چاہے گا وہاں شادی کروں گا"

"تو ٹھاکر صاحب کے ہاں وہ راضی نہیں ہیں"

"بالکل نہیں صاحب"

"سچ کہتا ہوں ایسی گُن سبھا کی لڑکی دوسری نہ ملے گی"

"یہ میں بھی جانتا ہوں"

"سارا محلہ اس کے پاؤں دھو دھو کے پیتا ہے"۔

"یقیناً! میں نے اُسے دیکھا ہے اور پہلی ہی مرتبہ میں نے اندازہ کر لیا۔ کتنی نیک اور سگھڑ لڑکی ہے۔ لیکن شادی مجھے تو کرنی نہیں ہے، بیاہ تو

ہو گا تاراچند کا، اور وہ حضرت اسی رو میں بہے چلے جا رہے ہیں جس میں آج کل کی ساری دنیا بہہ رہی ہے۔"

"پھر بھی آپ نے انہیں سمجھایا تو ہوتا۔"

"سمجھایا ہوتا" ارے صاحب دو مہینہ سے جھک مار رہا ہوں، میں نے کہا، اس کی ماں نے سمجھایا، اس کی بہن نے اونچ نیچ سمجھائی، بتائی، سکھائی"

"پھر؟"

"پھر کیا وہی مرغے کی ایک ٹانگ!"

کچھ دیر تک مجلس پر سناٹا چھایا رہا، پھر ٹھاکر صاحب نے لکشمی نرائن سے کہا:-

"چلیئے چلیں"

"چلیئے"

متھرا داس نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا،

اب ٹھاکر صاحب کو بڑی فکر پیدا ہو گئی کہ کیا کریں۔ ڈاکٹر تاراچند سے بڑی امید تھی، لیکن آج وہ امید بھی جاتی رہی،

پھر اب؟

. . . . تین مہینے گذر گئے . . . .

آج موتی پرشاد کے ایم اے پاس ہونے کی خوشی میں ٹھاکر جوتی پرشاد نے

بہت بڑے جلسہ کا انتظام کیا تھا۔ شہر کے تمام معززین، رؤسا، شرفا، اور حکام اعلیٰ مدعو تھے، ٹھاکر صاحب نے اس تقریب میں مہاراجہ صاحب سے بھی شرکت کی درخواست کی تھی اور انہوں نے ازراہ رحم وکرم یہ درخواست منظور بھی فرمالی تھی، چونکہ یہ خبر عام ہوگئی۔ اس لئے جن جن حضرات کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی، سب جوق درجوق، بڑے ذوق وشوق سے تشریف لائے تھے، سب لوگ آچکے تھے۔ اب صرف مہاراجہ صاحب بہادر کا انتظار تھا . . . . .

. . . . ڈیڑھ گھنٹہ کے طویل انتظار کے بعد، مہاراجہ صاحب کی سواری آئی، حاضرین نے سروقد کھڑے ہوکر استقبال کیا، مہاراجہ صاحب خندہ پیشانی کے ساتھ بڑے لوگوں سے مصافحہ کرتے اور چھوٹے لوگوں کے آداب وکورنش کا جواب گردن کی ہلکی سی جنبش سے دیتے ہوئے، آگے بڑھے۔ بیچ میں ایک شاندار شامیانہ نصب تھا۔ شامیانہ کے اندر مہاراجہ صاحب لے جاکر بٹھائے گئے، ان کے تشریف فرما ہوتے ہی حاضرین میں سے بڑے بڑے حکام وامرا شرفا ورؤسا ان کے گرد آکر بیٹھ گئے۔ گویا اس بارات کے دولہا مہاراجہ صاحب ہی تھے!

ٹھاکر جوتی پرشاد بڑے ادب واحترام کے ساتھ مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نذر پیش کی جو قبول فرمائی گئی۔ پھر انہوں نے موتی پرشاد

کو حضور میں پیش کیا، پاؤں چھوئے اور پھر نذرِ عقیدت پیش کی۔ یہ نذر بھی قبول فرمائی گئی۔ مہاراجہ صاحب نے موتی پرشاد کو شرفِ کلام سے نوازا اور اُن سے دو ایک باتیں کیں!

پھر ٹھاکر صاحب دست بستہ آکر کھڑے ہو گئے۔

"کیا ہے ٹھاکر؟" ۔ مہاراجہ نے پوچھا۔

"تکلیف تو ہو گی حضور ذرا اندر چلیں، وہاں بھی آپ کے درشن کے لئے بے چین ہیں"۔

"ہاں، ہاں، کیا مضائقہ ہے، چلو"

مہاراجہ صاحب ٹھاکر صاحب کے ساتھ تن تنہا زنان خانہ میں تشریف لے گئے، یہاں بھی مہاراجہ صاحب کی خوب پرستش ہوئی، گھر کی ایک ایک عورت سامنے آئی، گھٹنے ٹیکے، پاؤں چھوے۔ اور مہاراجہ کی خدمت میں نذر پیش کرنے کی عزت حاصل کی، آخر میں جمنا کی باری آئی ——— ریشمی کپڑوں میں لپٹا ہوا ایک ریشمی جسم . . . . . . گھونگھٹ نکالے ہوئے آگے بڑھی ٹھاکر صاحب نے لپک کر اس کا چہرہ بے نقاب کیا۔ اور فرمایا:-

"مہاراجہ سے پردہ؟"

پھر اسے لے کر سامنے آئے نذر دلوائی۔ مہاراجہ نے نذر قبول کی اس کی طرف دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتے رہے۔

"سرکار، یہ میری چھوٹی لڑکی جمنا ہے۔"

"جمنا! اچھا یہ جمنا ہے۔"

"سرکار!"

مہاراجہ نے پھر ایک نگاہِ غلط انداز جمنا پر ڈالی، اور ہٹالی۔ اس وقت ان کے سامنے جو مجسمہ کھڑا تھا وہ گوشت اور پوست کا بنا ہوا مجسمہ نہیں تھا بلکہ رنگ و بو حسن و دلکشی، اور زیبائی و رعنائی کی ایک پاکیزہ تصویر تھی مہاراجہ صاحب کی نظر سے ہر روز حسن کے نادر نمونے گذرتے رہتے تھے، اسلئے حسن و جمال کی پرکھ میں وہ ماہرانہ درجہ رکھتے تھے، وہ خاموش تھے لیکن تاثر ان کے چہرہ گرامی سے ہویدا تھا۔ ٹھاکر صاحب پھر سامنے آکر دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

مہاراجہ نے زیر لب تبسم کے ساتھ پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"سرکار ایک تمنا اور تھی۔"

"کہو۔"

"سرکار بچن دیں تو کہوں۔"

"کہو، ضرور کہو، ہو سکا تو ہم اسے ضرور پورا کریں گے۔"

"جمنا کو اپنی لونڈی بنا لیجئے۔"

مہاراجہ صاحب خاموش رہے۔

ٹھاکر صاحب نے پھر سلسلۂ سخن شروع کیا۔

"سرکار نے بچن لے چکا ہوں"۔

"ہاں، لیکن میں شادی نہیں کر سکتا"

"وہ سرکار کی سیوا کرے گی، سرکار شادی نہ کریں لیکن اسے لونڈی بنا لیں"

"مجھے کوئی عذر نہیں"۔

"لیکن سرکار، وہ اسی وقت حضور کے ساتھ محل جائے گی، وہ سرکار کی لونڈی ہے لیکن اس برتاؤ سے ہماری عزت افزائی ہوگی"

(مسکرا کر) "کیوں جمنا، تم ہمارے ساتھ چلو گی"

(گلو گیر آواز سے) "سرکار کی کرپا ہے"

مہاراجہ صاحب پر عبیر و گلال کی بارش کی گئی۔ نقرئی اور طلائی ہار پہنائے گئے، اس طرح وہ ایک دولہا کی سج دھج سے باہر تشریف لائے!

مہاراجہ صاحب کے باہر آتے ہی نہ جانے کس طرح تمام حاضرین کو معلوم ہو گیا کہ مہاراجہ صاحب نے از راہ ذرہ نوازی و بندہ پروری، جمنا کو اپنی کنیزی میں قبول کر لیا ہے، تھوڑی دیر وہ باہر تشریف فرما رہے، پھر جمنا دلہن بنی ہوئی باہر لائی گئی، اور مہاراجہ صاحب کے پہلو میں ایک کرسی پر بٹھا دی گئی۔

اگر کچھ شبہ تھا وہ بھی رفع ہو گیا، پھر مہاراجہ صاحب اُٹھے، اُن کے اُٹھتے ہی گویا مجلس برخاست ہو گئی، آگے آگے مہاراجہ صاحب ان کے پیچھے پیچھے جمنا۔ اس کے پیچھے جوتی پرشاد، اُن کے پیچھے موتی پرشاد، اور پھر خاندان کے ارکان، شہر کے رؤسا، شرفا اور ریاست کے حکام و عمال، مہاراجہ نے اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر جمنا کو کار میں بٹھایا، پھر خود بیٹھے اور کار شاہی محل کی طرف تیزی سے روانہ ہو گئی۔

حاضرین محفل کی ایک بڑی تعداد نے ٹھاکر جوتی پرشاد کو اس لائق رشک خوش قسمتی پر دلی مبارکباد دی، ٹھاکر صاحب نے مغرورانہ نیاز مندی کے ساتھ مبارکباد پر شکریہ ادا کیا، البتہ موتی پرشاد جز بز ہو رہے تھے لیکن زبان ان کی بھی خاموش تھی، اگر کچھ کہنا بھی چاہتے تو کیا کہہ سکتے تھے؛

دوسرے روز مہاراجہ صاحب نے دس ہزار روپیہ نقد ٹھاکر جوتی پرشاد کو مرحمت فرمایا، ان کے منصب میں ترقی کر دی، ان کی تنخواہ بھی تین سو سے بڑھا کر ۵۰۰ روپیہ ماہوار کر دی۔

موتی پرشاد بھی ایم۔اے پاس کر کے آئے تھے، اب ارادہ تھا کہ تلاش معاش میں سرگرداں ہوں گے، ریاست میں کوشش کریں گے۔ اگر کوئی معقول ملازمت مل گئی تو خیر، ورنہ برطانوی ہند میں قسمت آزمائی کریں گے۔ لیکن خوش قسمتی سے ان مراحل کے طے کرنے کی نوبت نہیں آئی، مہاراجہ صاحب نے تین سو روپیہ

ماہوار پر اُنہیں اپنا لے۔ وثیقہ سی بنا لیا، ذمہ داری کچھ نہیں۔ محنت بالکل نہیں اور تنخواہ توقع سے زیادہ معقول۔

اسی سال موتی پرشاد کے چھوٹے بھائی کامتا پرشاد نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تھا، ٹھاکر صاحب کا ارادہ تھا، اس کی مزید تعلیم کا سلسلہ بند کر دیں گے۔ اور اسے کوئی چھوٹی موٹی تجارت کرائیں گے لیکن اُسے مہاراجہ صاحب کے حسب الحکم ریاست کی طرف سے ۳۰ ماہوار کا وظیفہ مل گیا۔ اس طرح، اس نے کالج کی زندگی کامیابی کے ساتھ شروع کر دی ؂

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۹)

چمپا!

حسن خدا کی وہ نعمت ہے جو نہ معلوم کس طرح تقسیم ہوتی ہے، حسین ہونے کے لئے، دولت و ثروت کی شرط نہیں، غربت اور مفلسی حارج نہیں، خاندانی وجاہت حسب نسب کی بلندی، ماں باپ کی نجابت، کچھ بھی ضروری نہیں، چمپا کی ماں ایک غریب گھرانے کی عورت تھی، جو بڑے گھروں میں خادمہ کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس کا باپ ایک کہار تھا جس نے اپنا شعار آوارگی اور بدمعاشی کو قرار

دے لیا تھا، وہ کئی مرتبہ جیل جا چکا تھا، اور جیل جانا اس کے لئے ایک تفریح کا سبب ہو گیا تھا۔ خود چمپا جب تک بچہ رہی، ماں کے ساتھ کام کرتی رہی، جب ذرا بڑی ہوئی سیٹھ دین دیال کے ہاں ان کی لڑکی کا بستہ مدرسہ لے جانے پر ملازم ہو گئی، جب ذرا سیانی ہوئی تو وہ پنڈت آتمارام کے ہاں پکانے ریندھنے کا کام کرنے لگی، جب وہ زندگی کی پندرہ سولہ بہاریں دیکھ چکی، تو اس کی شادی اس کے ایک ہم قوم رامو سے کر دی گئی۔

چھ مہینہ تک میاں بیوی سکھ کی بنسری بجاتے رہے، بظاہر رامو ایک جگہ دس روپیہ ماہوار پر ملازم تھا۔ پرائیویٹ طور پر چوری اور نقب زنی کا کام کرتا تھا، ایک دفعہ پکڑا گیا، گرفتار ہوا، اور سب دفعہ کی کسر ایک ہی بار نکل گئی، چھ سال کی سزا ہوئی، جیل میں اس نے ایک قیدی پر قاتلانہ حملہ کیا، اس جرم میں وہ کالے پانی بھیج دیا گیا۔ چمپا کا باپ مر چکا تھا، ماں بوڑھی ہو چکی تھی۔ اب اس کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا تھا، وہ غریب تھی لیکن دولتِ حسن سے مالا مال تھی۔ وہ نانِ شبینہ کو محتاج تھی، لیکن روپے پیسے والے لوگ اس کے درشن کے لئے بیقرار رہتے تھے، وہ بے مایہ تھی، لیکن بڑے بڑوں کی نگاہیں اس پر پڑتی تھیں، اور جم کر رہ جاتی تھیں، اس کا حسن، حسنِ بے پروا نہیں تھا وہ اپنی قدر و قیمت سے واقف تھی، وہ لوگوں کے جذبات سے کھیلنا جانتی تھی وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی ایک کی ہو رہے۔ وہ دنیا کا لطف اٹھانا چاہتی تھی عیش کی زندگی

بسر کرنا چاہتی تھی، آزادی اور مسرت کے دن گذارنا چاہتی تھی، اس کی یہ آرزو پوری ہوئی، بی نصیبن شہر کی طوائفوں کی چودھرائن تھیں۔ اُن کی نگاہ اس جوہر قابل پر پڑی، اور اُنہوں نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا، یہ گودڑ کا لال یہ وہ موتی ہے جو سنگریزوں میں پڑا ہوا اپنی آب کھو رہا ہے، دو چار دفعہ اُنہوں نے دوڑ دھوپ کی، اور اس کے بعد ایک اعلیٰ درجہ کے بالاخانہ کا انتظام کر دیا۔

چمپا اَن پڑھ تھی، جاہل تھی، شاید پھوہڑ بھی تھی، لیکن چند ہی دنوں میں اس پر ایسی صیقل ہو گئی کہ چمپا وہ چمپا نہ رہی، اب وہ ایک مہذب، موقع شناس اور کامیاب صیّاد تھی۔ اس کے دام میں آ کر نکل جانا ناممکن تھا۔

بگڑے ہوئے رؤسا آوارہ شریف زادے چمپا کے گھر کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے، آج کل نواب فخر الدولہ، اور نواب زادہ ارادت علی خاں میں رقابت کے پینگ بڑھ رہے تھے، نواب صاحب پشتینی نواب تھے، عمر کوئی ۶۰، ۶۵ کے لگ بھگ ہو گی، خشخشی داڑھی، مونچھیں ندارد، غرارہ دار پاجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، سر کے بال سفید، جن پر مہندی کی گلکاری، بٹیر بازی اور مُرغ بازی سے خاص شغف، نواب صاحب چمپا پر دل و جان سے فریفتہ تھے اپنے وثیقہ اور دولت کا بڑا حصّہ اس بتِ شوخ و شنگ کی ناز برداریوں پر صرف فرما دیتے تھے، نواب زادہ صاحب ابھی نوجوان تھے عمر کوئی ۲۶، ۲۷ سال کی مضبوط تنومند، خوبصورت، خوش وضع، خوش لباس، خوش مذاق، والد کے

انتقال کے بعد ساری جائیداد کے مالک ہوگئے تھے۔ مصاحبوں کا ہر وقت جمگھٹ لگا رہتا تھا، اور یہی مصاحبین ہر وقت نئی نئی راہیں دکھایا کرتے تھے۔ اور نواب زادہ صاحب کی کفش برداری پر بھی انہیں ناز تھا وہی وسیلہ بنے، اور انہوں نے چمپا کو اُن سے متعارف کرا دیا۔"

اب نواب زادہ صاحب کا اکثر وقت چمپا کے یہاں گذرتا تھا، کبھی کبھی اسے اپنے دیوان خانے میں یاد فرما لیتے تھے۔ بظاہر چمپا ان پر مائل تھی ان کی مجلس میں وہ اکثر نواب فخر الدولہ پر فقرے کسا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ نواب زادہ صاحب نے پوچھا۔"

"کہو تو نواب صاحب کا کیا حال ہے؟"

"اچھے ہیں روز تشریف لاتے ہیں"۔

"وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں"۔

(ہنس کر) "وہ تو کم میں انہیں زیادہ، بہت زیادہ چاہتی ہوں۔"

"اور ہمیں"۔

"آپ کو بہت کم۔"

"یہ کیوں؟"

"آپ کا میرا کیا جوڑ، ہم آپ تو برابر کے ہیں، نواب صاحب میرے باپ کے ہم عمر ہیں، جو محبت لڑکی کو اپنے باپ سے ہو سکتی ہے، دوسرے سے

نہیں ہو سکتی ہے"

اس فقرہ پر نواب صاحب نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور فرمانے لگے

"چمپا تم بہت شریر ہو"

"آپ بھی تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں"۔

"اگر نواب صاحب سن لیں؛"

"تو کیا ہوگا؛"

"وہ خفا نہیں ہو جائیں گے"۔

"خفا ہوں گے تو میں منالوں گی"۔

"یہ کیسے؛"

"کہوں گی، آپ خفا ہو گئے، جائیے ہم بھی نہیں بولتے"۔

"پھر؛"

"پھر کیا، بس فوراً خوشامدیں شروع کر دیں گے"۔

واہ بھئی! یہ منانے کا بڑا اچھا ٹکا ہے"۔

"جی اور کیا؛"

"تو اب ہم بھی تمہیں اسی طرح منایا کریں گے۔

"واہ کہیں چلی نہ ہو"

"یہ کیوں"؛

"یہ یوں ہی"

ایک مرتبہ خود نواب صاحب آئے انہوں نے چمپا سے فرمایا:۔

"وہ لونڈا اب تمہارے ہاں بہت آنے لگا ہے۔"

"کیا کروں سرکار، گھر سے تو نکالا نہیں جا سکتا۔"

"وہ چاہتا کیا ہے، سنا ہے تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں وہ تو چاہتے ہیں۔"

"اور تم۔"

"یہ آپ جانیئے۔"

اس جواب پر نواب صاحب کھل گئے۔ باغ باغ ہو گئے۔ ان کا بس چلتا تو چمپا کو آنکھوں میں بٹھا لیتے، کہنے لگے:۔

"چمپا یہ باتیں تمہیں کس نے سکھائیں؟"

"حضور کے فیض صحبت نے۔"

"ہاں وہ تمہارا چندن ہار آیا؟"

"ابھی کہاں؟"

"اچھا آج آجائے گا۔"

نواب صاحب اور نواب زادہ صاحب کی عنایت سے چمپا کی گرمی بازار قائم تھی۔

اتفاق سے ایک تقریب میں مہاراجہ صاحب کی نظر اس پر پڑی، اور ان کی نگاہ انتخاب نے اُسے چُن لیا۔

اشارہ کی دیر تھی، چمپا شاہی محل میں پہنچ گئی تمام معاملات بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا گئے۔ بی لطیفن بھی نہال ہوگئیں، چمپا کی ماں بھی نوازی گئی اور چمپا کا تو کیا کہنا، اب اُسے نہ نواب صاحب کی ضرورت تھی نہ نواب زادہ صاحب کی!

ایک برس تک نواب صاحب نے اُسے بڑے چاؤ سے رکھا، خوب ہی خوب اس پر نوازشیں کی گئیں۔ کوئی آرزو نہیں تھی، جو پوری نہ کی گئی ہو اس نے جو چاہا وہی کیا گیا، ہیرے جواہرات سے اُسے پاٹ دیا گیا، چاندی سونے کے سکے ٹھیکریوں کی طرح اس کے پاس پڑے رہتے تھے، مہاراجہ صاحب اسے چاہتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ بڑے لوگوں کی چاہت دیرپا نہیں ہوتی، وہ بے تابانہ محبت کرتے ہیں، لیکن بہت جلد اس مشغلہ سے اُکتا جاتے ہیں، وہ تنوع پسند ہوتے ہیں، بھونرے کی طرح ہر پھول کا رس چوسنا چاہتے ہیں مہاراجہ صاحب نے جب تک چمپا کو چاہا، دُنیا و مافیہا سے بے خبر رہے، جب تک چاہتے رہے، اس کے ایک اشارہ چشم پر دولت کونین لٹا دینے پر تیار رہے لیکن جب اس سے جی بھر گیا، تو انہوں نے ایسا مزہ چکھایا، جو تاریخ حسن و عشق میں یادگار رہے گا۔

ایک بار مہاراجہ نے چمپا کو یاد فرمایا۔

"چمپا!"

"جی سرکار!"

"تم جانتی ہو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں"؟

"بہت زیادہ سرکار!"

"اور تم؟"

"میری جان بھی اگر سرکار کے کام ...."

"ٹھیرو! ....."

.... چمپا خاموش ہو گئی۔

"ایک بات پوچھتا ہوں"۔

"فرمایئے ..... سر... کار!"

"بتاؤ گی؟"

"ضرور"

"بالکل سچ سچ"؟

"تم کسی سے محبت کرتی ہو؟"

"نہیں"۔

"چمپا! جھوٹ نہ بولو"۔

"میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں"۔

"بالکل غلط"

"میں سرکار کی بات ٹال نہیں سکتی"۔

"میرے پاس ثبوت ہے!"

یہ کہتے کہتے مہاراجہ صاحب کا چہرہ پُر جلال ہو گیا، رُخ انور تمتما اٹھا، گردن کی رگیں پھول گیئں، آواز بلند ہو گئی، انہوں نے کڑک کر کہا،

"یہ خط کس کا ہے؟ کیا نواب زادہ کا نہیں؟"

"ہو گا، میں نہیں جانتی!"

"اسے پڑھو"

چمپا نے خط پڑھنا شروع کیا، اور پڑھ کر مہاراجہ کی طرف بڑھا دیا،

"بتاؤ!"

"سرکار میرا کسی سے اب کوئی واسطہ نہیں ہے!"

"لیکن انہیں تو لکھا ہے، وہ تمہارے لئے بیچین رہتے ہیں، تم ان کے لئے تڑپتی رہتی ہو"

"انہوں نے لکھا، میں نے تو نہیں"۔

"یہ بھی لکھا ہے، چلو ہم تم کہیں اور دنیا بسائیں"

"لیکن میں تیار نہیں ہوں"۔

مہاراجہ صاحب، برہمی کے عالم میں باہر نکلے اپنے پرائیویٹ سکریٹری

کو طلب فرمایا اور حکم دیا،

"چمپا کی شدید نگرانی کی ضرورت ہے!"

"بہت خوب سرکار"۔

"آنے جانے والے لوگوں پر کڑی نگرانی چاہیئے"۔

"ایسا ہی ہوگا سرکار"۔

"کوئی ایسی عورت، جسے تم خود نہ جانتے ہو، اس کے پاس نہ جانے پائے"

"جیسا حکم ہو"۔

"اس کے تمام زیورات توشہ خانہ میں داخل کردو"

"بہت بہتر"

"اس کی تنخواہ، اب ایک ہزار کے بجائے دو سو کر دی جائے۔"

"ایسا ہی ہوگا"

"فرمائشات کے سلسلہ میں اسے الگ سے کوئی رقم نہ دی جائے"۔

"بہت اچھا سرکار!"

یہ احکام نافذ کر کے مہاراجہ صاحب محل کے اندر تشریف لے گئے

اب چمپا کی زندگی قیدیوں کی سی بسر ہو رہی تھی، اپنی قیام گاہ سے وہ نکل نہیں سکتی تھی ۔ اس کے پاس پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا تھا ۔ چمپا پہلے سنہرے پنجرے میں قید تھی، لیکن اب تو وہ آہنی سلاخوں میں مقید تھی یہ آہنی

اب اس کے پروبال کو پچھلے دے رہی تھیں۔ چمپا نے مہاراجہ کے عتاب کو کم کرنے کی بہت کوشش کی۔ روئی، گڑگڑائی، منت کی، التجا کی، سب کچھ کیا، لیکن مہاراجہ صاحب ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ان کا عتاب، پہاڑ کی طرح اٹل تھا، وہ اب چمپا کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

مہاراجہ صاحب شکار کو گئے ہوئے تھے ان کی غیر حاضری میں نگرانی کرنے والوں کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو جایا کرتی تھی۔ آج اُسے موقع ملا سیر کے بہانے سے وہ سرکاری موٹر پر باہر نکلی، ڈرائیور کو اس نے حکم دیا، شہر سے باہر چلو، چلتے رہو جب تک میں منع نہ کروں، موٹر ہوا سے باتیں کرتی ہوئی روانہ ہوئی، سورج کی روشنی مدھم ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اندھیرا چھا گیا۔ . . . .

. . . جب گاڑی شہر سے بہت دور نکل گئی تو ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے کہا:۔

"مہارانی صاحب، رات ہو چلی ہے، اب واپس چلیں۔"

"ابھی نہیں!"

"سرکار، سکتر صاحب خفا ہوں گے۔"

"ہونے دو، بکو مت، چلے چلو۔"

ڈرائیور نے چپ سادھ لی، اور موٹر فراٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار دھیمی کی اور پھر روک لی۔ چمپا نے پوچھا:۔

"یہ کیا؟"

"سرکار آگے خطرہ ہے"

"کیسا خطرہ؟"

(انگلی سے اشارہ کرکے) "یہ دیکھئے!"

سڑک پر کچھ اُکھڑے ہوئے درخت پڑے تھے، جنہوں نے راستہ بالکل بند کر دیا تھا، اب واپس چلنے کے لئے ڈرائیور گاڑی موڑنا ہی چاہتا تھا کہ چار پانچ مسلح آدمی نمودار ہوئے، چہروں پر انہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ اس لئے پہچاننا اور شناخت کرنا ناممکن تھا۔ اُن میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"اُترو!"

ڈرائیور نے بیٹھے بیٹھے سر باہر نکالا۔

"جانتے نہیں ہو مہارانی ہیں؟"

"سب جانتے ہیں، فوراً باہر نکلو"

ڈرائیور نے موٹر اسٹارٹ کیا، دو آدمی آگے بڑھے۔ اُنہوں نے ڈرائیور کو بے قابو کر لیا۔ اس کی مشکیں کسیں، آنکھوں پر پٹی باندھی، اور اس کو ایک گٹھڑی کی صورت میں جکڑ کے سیٹ پر ڈال دیا، تیسرا آدمی سامنے آیا، اس نے چند لاتیں جمائیں، ڈرائیور صاحب، خاموشی سے یہ سب برداشت کرتے رہے

پھر وہ آدمی چمپا کی طرف بڑھا۔

"چلیے مہارانی صاحبہ"۔

"کہاں؟"

"جہاں ہم لے چلیں"

"اور اگر میں نہ جاؤں؟"

"تو ہم زبردستی لے چلیں گے"۔

"جانتے ہو انجام کیا ہوگا"

"خوب اچھی طرح"

"پھر بھی باز نہیں آتے"

"نہیں مہارانی صاحبہ ہم مجبور ہیں، اب وقت کم رہ گیا ہے، آپ چلتی ہیں یا نہیں؟"

"اچھا چلو!"

چمپا ان نووارد لوگوں کے جلو میں روانہ ہوئی، ڈرائیور صاحب سرکاری کار میں استراحت فرما رہے ہے، تھوڑی دور تک یہ لوگ سب پیدل چلتے رہے چلتے چلتے چمپا نے کہا۔

"گوبند اب مجھ سے پیدل نہیں چلا جاتا"

"بس اب تھوڑی دور اور"

"کتنی دُور؟"

"یہی چند قدم"۔

آگے موڑ تھی، یہ لوگ اسی طرف مڑ گئے، یہاں سے ریاست سورج پور کی حد ختم ہوتی تھی، حد ختم کرنے کے بعد، دُوسری سڑک پر قدم رکھتے ہی سامنے ایک آراستہ پیراستہ موٹر نظر آئی۔جس شخص کو چمپا نے گوبند کہہ کر پکارا تھا، اُس نے دُوسرے آدمیوں کو رُخصت کر دیا۔اَور خود چمپا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ایک ہی سیٹ پر دونوں پاس پاس بے تکلفی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، جب کار روانہ ہوئی تو گوبند نے کہا:-

"کہو چمپا، یہ ڈرامہ کیسا رہا؟"

(مسکرا کر) "بہت اچھا"

"اب ہماری زندگی کا نیا دَور شروع ہوگا"۔

"اگر مہاراجہ کو پتہ چل گیا تو؟"

"انہیں پتہ نہیں چل سکتا"

"اگر چل جائے؟"

"تو میرا کیا بگاڑ لیں گے؟"

"تمہاری جائیداد ہے، جاگیر ہے، مکانات ہیں"

"تو؟"

"ضبط نہیں کر لیں گے؟"

"اتنی ہمت نہیں ہے۔"

"یہ کیسے"؟

"پتا جی کو جانتی ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں جانتی؟"

"پولٹیکل ایجنٹ سے ان سے بڑا یارانہ ہے، ریذیڈنٹ بھی ان کا دوست ہے، ابھی چھ مہینے ہوئے، مہاراجہ صاحب کو پتاجی ساٹھ لاکھ روپیہ قرض دے چکے ہیں۔ بچہ جی کی ہر طرح سے گردن دبی ہوئی ہے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"گوبند مجھے تو ڈر لگتا ہے"۔

"ڈر کی کیا بات ہے چمپا؟"

"وہی مہاراجہ سے"

بالکل بے فکر رہو، میں تمہیں اس شہر میں لایا ہوں، یہاں تو اُن کی حکومت نہیں ہے۔ یہاں تو انگریزوں کا راج ہے، یہاں کون چوں کر سکتا ہے یہاں بھی میری کوٹھی ہے، جائیداد ہے، دوکان ہے کاروبار ہے تم میری مہارانی بن کر یہاں رہو کاروبار کے سلسلہ میں بس زیادہ تر یہاں رہتا ہی ہوں، کبھی کبھی سورج پور چلا جاتا ہوں۔ سو اب بھی جاتا رہوں گا۔ تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔"

"ترکیب تو اچھی ہے"

"اور کیا، تم خواہ مخواہ گھبرائی جاتی ہو"

"مجھے تو بھی ڈر لگتا ہے"

(اسے آغوش میں لے کر) "پھر وہی ڈر؟"

مہاراجہ کو دوسرے روز چمپا کی گمشدگی کی اطلاع ملی، وہ فوراً سورج پور واپس آئے، پہلے تو انہیں یہ شبہ ہوا یہ کوئی سازش ہے، لیکن جب انہوں نے دیکھا کوئی چیز غائب نہیں ہے، چمپا کی ہر چیز سلیقہ اور قرینے سے رکھی ہوئی ہے، اور پھر جب ڈرائیور کی آپ بیتی انہوں نے سنی، جو رات بھر موٹر میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا تھا، تو انہیں یقین ہو گیا کہ چمپا بھاگی نہیں ہے، کسی حادثہ کا شکار ہوئی ہے۔

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

150/3, Bihar
Colony
KARACHI.

باب

(۱۰)

انتقام

مہاراجہ کے واپس آتے ہی ریاست کی ساری مشینری حرکت میں آگئی چمپا کی گمشدگی، مہاراجہ کی ذاتِ گرامی کے لئے ایک چیلنج تھی، خواہ وہ خود چمپا کی طرف سے ہو، یا کسی اور سرپھرے کی طرف سے، اور اس چیلنج کو مہاراجہ نے قبول فرما لیا تھا۔

فوراً لالہ ترلوک سہائے نئے منسٹر "لا اینڈ جسٹس" طلب کئے گئے،

وہ لرزاں و ترساں حاضر ہوئے، وفورِ ہیبت سے چہرہ کا رنگ زرد تھا، منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، وہ آئے، اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔

Tannery Road, ... COLONY, KARACHI

"ترلوک!"

"حضور"

"نمکحرام"

لالہ جی چپ چاپ اس خطاب کو شیر و شہد کی طرح پی گئے، مہاراجہ صاحب پھر گویا ہوئے۔"

"تمہاری اماں کہاں گئیں؟"

"جی حضور"

"چمپا کہاں ہے؟"

"تفتیش ہو رہی ہے حضور"

"کب تک ہوتی رہے گی تمہاری تفتیش؟"

"حضور چاروں طرف جاسوس دوڑ رہے ہیں، جہاں بھی چمپا ملی فوراً گرف کی جائے گی۔ مجال ہے اس کی کہ حضور کے دامن کے سوا اسے کہیں اور پنا مل سکے۔"

"کب تک مکمل ہو جائے گی تمہاری تفتیش؟"

"یہی دو چار روز میں سرکار"

اگر ایک ہفتہ تک چمپا نہ ملی تو تمہیں اپنے عہدہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے، اور . . . . . عزت سے بھی، بہت ذلیل ہو کر جاؤ گے یہاں سے"

"بہت خوب حضور"

مہاراجہ نے لالہ جی کو رخصت کیا، اپنے وزارت کدہ میں تشریف لائے، مسٹر اعجاز حسین انسپکٹر جنرل پولیس کو طلب فرمایا، وہ حاضر ہوئے، انہیں اس طرح گھور کر دیکھا کہ گویا کچا چبا جائیں گے، کچھ دیر تک سکوت طاری رہا، پھر فرمایا،

"چمپا ملی؟"

"ابھی نہیں"

"کب تک کامیابی کی اُمید ہے؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا کوشش ہو رہی ہے"

"ایک ہفتہ کے اندر مل جانی چاہیئے"

"اس کا وعدہ مشکل ہے"

اگر مشکل ہے تو سمجھ لو، نہ تمہاری خیر ہے، نہ میری،

"سرکار نے فرمایا ہے اگر ایک ہفتہ کے اندر چمپا نہ ملی تو وزیر سے لے کر تھانہ دار تک سب کو برخاست کر دیں گے

سب کی جمع جائیداد ضبط کرلیں گے۔ سب کو جیل میں ڈالکر سزا دیں گے، سب کا سامان اور جائیداد قرق کرلیں گے، سب کے اہل وعیال کو طرح طرح کی تکلیف دیں گے۔ اپنے اوپر تم رحم نہیں کرتے تو مجھ پر کرو، اپنے بال بچوں پر کرو اعجاز"

یہ کہتے کہتے لالہ جی کا گلا بھر آیا، انہوں نے اعجاز کو اس طرح بلایا تھا کہ وہ حاکم تھے، اور اعجاز محکوم وہ افسر اعلیٰ تھے، اور اعجاز ماتحت، اسی لئے شروع میں انہوں نے کافی ہیبت اپنے چہرہ پر طاری کرلی تھی، لیکن جب وہ اعجاز کو مہاراجہ کا سراپا سنانے لگے، تو مہاراجہ جو کچھ کرنے والے تھے وہ سب انہوں نے اپنے کشف سے معلوم کرلیا، اور رونے لگے، اب یہ دونوں افسر اور ماتحت نہیں تھے، دوست تھے، ایک دوسرے کے خیر اندیش،

"اعجاز تم روپیہ کی پروا نہ کرو۔"

"روپیہ میں پانی کی طرح صرف کر رہا ہوں"

"کچھ پروا نہیں، اور صرف کرو، ہر طرف اپنے آدمی دوڑا دو، اور جس قیمت پر ہو سکے چمپا کو ڈھونڈ نکالو۔ پھر ہم تم دونوں نہال ہو جائیں گے"

"اطمینان رکھیئے۔"

اعجاز نے دن رات ایک کردیا، اور آخر کار پتہ چلا لیا کہ چمپا گو بند کے پاس ہے، وہ کسی حادثہ کا شکار نہیں ہوئی ہے بلکہ باقاعدہ سازش کرکے

بھاگی ہے۔ گوبند کو اپنے باپ لکشمی نرائن پر غرّہ ہے، وہ بڑی بے پروائی سے چمپا کے ساتھ داد عیش دے رہا ہے۔ اعجاز نے رپورٹ لالہ جی کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے مہاراجہ کی خدمت میں اسے پیش کر دیا۔

مہاراجہ نے لالہ جی اور اعجاز کو تخلیہ میں یاد فرمایا، واقعات سُنے اور رازدارانہ انداز میں کہا اعجاز تم نے انعام کے قابل کام کیا ہے اور لالہ جی آپ نے بھی۔ میں آپ دونوں کو نہال کردوں گا، لیکن ابھی ایک کام اور باقی ہے اور وہ بھی آپ دونوں کو کرنا ہے۔

"فرمائیے" دونوں نے کہا۔

"گوبند تو یہاں آتا ہی رہتا ہے، اسکی زندگی کا چراغ گل ہونا چاہیئے اور چمپا کو جلداز جلد میرے سامنے پیش ہونا چاہیئے"

"برطانوی ہند کا معاملہ ہے سرکار وہ یہاں تو ہے نہیں۔ نہ آتی ہے کبھی" ۔اعجاز نے کہا۔

"پھر انعام کاہے کا لوگے، بالکل فکر نہ کرو نہال کردوں گا تمہیں"۔

"بہت خوب، چمپا حاضر کردی جائے گی"۔

"میں مطمئن رہوں"

"بالکل"

"اپنے مہاراجہ کو قول دیتے ہو"۔

"جی سرکار، قول مرداں جاں دارد"

مجلس برخاست ہوگئی۔

تین چار روز بعد کا واقعہ ہے، گوبند سورج پور آیا ہوا تھا، رات کو وہ سینما دیکھنے گیا، واپسی میں ایک اندھیرے راستہ سے اسکی کار گذری، دفعتاً فائرنگ کی آواز۔ گولی موٹر کے ٹائر میں لگی اور وہ کھڑا ہو گیا۔ گوبند ہکا بکا گاڑی سے اترا، جیسے ہی اس نے باہر قدم نکالا سامنے سے کسی نے پستول چلایا گولی سینہ کو توڑتی ہوئی نکل گئی، اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ سب اس طرح چشم زدن میں ہو گیا کہ قاتل کا تعاقب بھی نہ کیا جا سکا۔ موٹر ڈرائیور بھاگ کر ایک درخت کے نیچے پناہ گزیں ہو گیا جب حملہ آور فرار ہو گئے، تو وہ چیختا ہوا نکلا، پستول کی آواز سنکر اڑوس پڑوس کے لوگ بھی اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ ڈرائیور کی چیخ سنکر کچھ لوگ نکلے، تھوڑی دیر میں اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔

گوبند کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے ریاست کے ہسپتال بھیج دی گئی وہیں اس کے والد روتے پیٹتے پہنچے، اعجاز صاحب ان کی دل دہی اور تسلی کر رہے تھے۔ اکلوتا بیٹا، اور وہ بھی اتنا ہونہار کہ وہ اُسے عصائے پیری سمجھے ہوئے تھے، یوں گذر جائے اور بوڑھا باپ صبر کر لے؛ یہ ممکن کیسے تھا

وہ رو رہے تھے، سینہ پیٹ رہے تھے۔ عورتوں کی طرح بین کر رہے تھے، اور حاضرین دم بخود اُن کی یہ حرکات دیکھ رہے تھے۔

دوسرے روز مہاراجہ صاحب بہ نفس نفیس سیٹھ لکشمی نرائن کے دولتکدہ پر جلوس فرما ہوئے، سیٹھ صاحب کا حالِ زار دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے، اُنہوں نے سیٹھ صاحب کو صبرِ جمیل کی تلقین کی، اور دلاسا دیا کہ قاتلوں کی تلاش میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا جائے گا اور انہیں کیفرِ کردار کو پہنچایا جائے گا۔

چمپا اس حادثے سے بے خبر تھی، دوسرے روز عین اسوقت جب مہاراجہ گوبند کے گھر پر تعزیت کے لئے گئے ہوئے تھے، گوبند کا پرانا ملازم ہانپتا کانپتا پہنچا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر چمپا گھبرا گئی۔ اُس نے پوچھا،

"خیر تو ہے، اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"(گھبراہٹ کے ساتھ) جلدی چلیئے۔"

"کہاں چلوں؟"

"صاحب کے پاس"

"وہ تو گوبند پور میں ہیں؟"

"ہاں وہیں بلایا ہے"

"وہاں میں کیسے جاسکتی ہوں، مہاراجہ پھر مجھے! نہیں زندہ چھوڑیں گے؟"

"اسی لئے تو میں آیا ہوں، بند گاڑی میں میرے ساتھ چلئے، شہر سے باہر جو ان کی کوٹھی ہے، اس میں چل کر اُتریئے ذرا اندیشہ ہوگا فوراً انگریزی راج میں آجایئے گا، اور اندیشہ ہونے بھی کیوں لگا؟"

"لیکن انہوں نے مجھے بلایا کیوں؟"

"ان کی زبان پر تو بس آپ ہی کا نام ہے"

"کیا ہوا انہیں؟"

"(رو کر) بچ جائیں تو غنیمت جانیئے۔"

"بتاؤ تو تلسی ہوا کیا؟"

"شیر کے شکار کو گئے تھے، نشانہ غلط ہو گیا، شیر جھپٹ کر بیٹھ گیا اب تو اُن کی گھڑیاں گنی جارہی ہیں، اگر کبھی ہوش میں آتے ہیں تو بس آپ کے نام کی رٹ لگا دیتے ہیں۔ بڑے سیٹھ نے مجھ سے پوچھا ماجرا کیا ہے، میں نے سب بتا دیا، انہوں نے کہا، کوئی پروا نہیں چمپا کو یہاں لے آؤ۔"

"تو چلوں پھر؟"

"فوراً"

چمپا نے جلدی جلدی کپڑے بدلے، بند گاڑی میں سوار ہوئی، اور تلسی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔ گاڑی کے دروازے پردوں سے اس طرح بند کئے گئے تھے کہ نہ چمپا باہر کی چیز دیکھ سکتی، نہ باہر سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ گاڑی

یں کون جا رہا ہے۔

بڑی دیر تک چلنے کے بعد گاڑی رُکی، پہلے تلسی اُترا، اس نے اُتر کر دروازہ کا پٹ کھولا۔ کہا۔

"آیئے"!

چمپا اُتری! اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یہ جگہ گوبند کی کوٹھی نہیں، سورج پور کا قصرِ شاہی ہے۔ وہ تلسی کی طرف مخاطب ہو کر کچھ پوچھنے والی ہی تھی کہ مہاراجہ صاحب قہر و جلال کی مورت بنے ہوئے سامنے کھڑے نظر آئے، اب تو چمپا کے،

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

مہاراجہ نے کڑک کر اس سے کہا۔

"اچھی تو ہو چمپا"۔

چمپا نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی کھڑی تھی۔ مہاراجہ نے پھر فرمایا،

"ہم کا ہے کو کبھی تمہیں یاد آتے ہوں گے!"

چمپا اب بھی خاموش تھی، دفعتہً مہاراجہ نے اپنے ملازموں کو حکم دیا، "لیجاؤ ے بالاخانہ پر، میں آتا ہوں"۔

یہ سنتے ہی چمپا کا رنگ رُخ اُڑ گیا، وہ جانتی تھی، "بالاخانہ" کی اصطلاح

کیا معنے رکھتی ہے؛ یہ وہ جگہ تھی جہاں، خاص الخاص مجرموں کو مہاراجہ
بہ نفس نفیس نت نئی سزائیں دیا کرتے تھے۔

بہر حال وہ کشاں کشاں بالاخانہ پر پہنچی؛ پیچھے پیچھے مہاراجہ بھی تشریف
لے آئے۔

یہ ایک وسیع کمرہ تھا، محل کی دنیا سے بالکل الگ، دس بارہ ملازم چمپا کو
گھیرے میں لئے ہوئے کھڑے تھے، مہاراجہ کے آتے ہی وہ کائی کی طرح پھٹ
گئے، ایک نگاہ مہاراجہ نے چمپا پر ڈالی، پھر فرمایا:-

"گنیش"!

ایک تنومند اور قد آور نوجوان آگے بڑھا، اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا
مہاراجہ نے حکم دیا، "اُتار دو اس کے کپڑے"۔

کپڑے اُتار دیئے گئے۔ اور چمپا یونانی علم الاصنام کا ایک نظر فریب
دیوی نظر آنے لگی، مہاراجہ کے ہاتھ میں کوڑا تھا، اُنھوں نے اُسے ہوا میں بلند
کیا، اور پڑنے لگی مار چمپا پر، وہ رو رہی تھی، فریاد کر رہی تھی، معافی مانگ
رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی، توبہ کر رہی تھی، لیکن،

ے یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

مہاراجہ کا کام جاری تھا۔

خوب اچھی طرح سزا دینے کے بعد مہاراجہ صاحب کمرہ سے نکلے، نیچے جاتے انہوں نے، حاضرین ہاتمکین سے مخاطب ہو کر فرمایا "اجازت ہے!" یہ کہا، اور نیچے اُتر گئے، اُن کے جاتے ہی، چمپا باری باری سے کئی کئی بار، ہر ہر شخص کی ہوس رانی کا شکار بنی، اس کا عریاں جسم، اور اس پر برتوں کے نشان اس کی آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں، اسکی بے کسی اور بے بسی، اس کی فریاد و فغاں، اسکی التجا اور خوشامد، کوئی چیز بھی، ان لوگوں کو متاثر نہ کرسکی انہیں اس سے بحث نہیں تھی کہ چمپا کا کیا حال ہو رہا تھا، اُن کے سامنے صرف یہ تھا کہ آج دِل کی کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے، سچی بات بھی تھی بقول پرکاش کے، ایسے موقعے روز روز کہاں ملتے ہیں،

یہاں تک کہ چمپا بیہوش ہوگئی، ان لوگوں نے اسے ایک صوفے پر لٹا دیا۔ چادر اڑھا دی اور نیچے چلے گئے، ان کے جانے کے بعد ایک سیاہ رو اور تیرہ دروں عورت آئی اور اس نے چمپا کو اپنے چارج میں لے لیا، تھوڑی دیر میں لیڈی ڈاکٹر صاحبہ آئیں اور اُنہوں نے تندہی کے ساتھ علاج شروع کردیا۔ لیکن۔

مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اس کی حالت سنبھلنے کے بجائے گرتی ہی گئی۔ کسے گو نبد کا غم کھائے جا

رہا تھا، اُسے معلوم ہو چکا تھا، اسکی زندگی کس طرح ختم کی گئی، اُسے گوبندسے کچھ محبت سی ہو گئی تھی، ہر وقت اس کی یاد کانٹا بنکر دل میں کھٹکتی رہتی تھی۔

تین چار مہینہ کے علاج کا نتیجہ یہ نکلا کہ چمپا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہر غم اور ہر مرض سے نجات پا گئی۔ اس کا پھول سا چہرہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا، یہ وہ کانٹا تھا جسے مہاراجہ بھی اپنے دلمیں اور آنکھ میں رکھتے تھے، آج اسے پاؤں تلے روند رہے تھے، چمپا کی موت کی خبر مہاراجہ نے اس بے پروائی سے سنی، گویا اُسنے مرنے میں دیر کی، آج سے پہلے کیوں نہ مری!

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۱۱)

پرائیویٹ سکریٹری!

مرزا اکرم کو مہاراجہ صاحب نے اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر فرمایا، مرزا صاحب بڑے دلچسپ آدمی تھے مصاحبوں کے مجمع میں بلبل ہزار داستان بنکر چہکتے تھے ایک مرتبہ اور بھی وہ مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری رہ چکے تھے، کچھ عرصہ بعد نکالے گئے، اب پھر اپنے سابقہ عہدہ پر سرفراز ہوئے تھے۔

خود اپنی گذری ہوئی باتیں بھی بڑے لطف لے لے کر بیان کیا کرتے تھے

ایک مرتبہ کسی نے کہہ دیا، مہاراجہ صاحب تم سے کچھ خفا سے ہیں
مونچھوں پر تاؤ دے کر کہنے لگے کیا پرواہ ہے، یہاں تو جوتے کھاتے
کھاتے کھال مضبوط ہو چکی ہے، سناؤں تمہیں کیا گزر چکی ہے مجھ پر یہیں
سورج پور میں؟ لوگوں نے تقاضا کیا، اور انہوں نے آپ بیتی شروع کی
میں موضع ہمیر پور کا زمیندار تھا، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس لئے
سب کا چہیتا تھا، میرے عنفوان شباب میں والدین داغ جدائی دے گئے، لاڈ
تلے سے زندگی بسر ہونے لگی، میری تھوڑے ہی دنوں میں ساری جائیداد صاف
ہو گئی، آخر چچا نے ترس کھا کر مجھے اپنے ہاں رکھ لیا، اور اپنا مختار بنا لیا ان
مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے، میری نالائقیوں سے ہمیشہ چشم پوشی کیا کرتے
تھے، میری ناشائستہ حرکتوں کا سلسلہ یہاں بھی جاری تھا، ہمیر پور میں تارا
آنکھ کا تارا بنی ہوئی تھی، چچا کے شہر میں مشہور طوائف گلشن، میرے گلشن
کا گل سرسبد بنی ہوئی تھی، آخر کار میری ان حرکتوں سے مجبور ہو کر چچا نے
کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا، مجھے علیحدہ تو نہیں کیا لیکن عضو معطل بنا دیا۔ اب
جائیداد کی آمد و خرچ سے مجھے کوئی واسطہ نہیں تھا، ایک طرف تو یہ حال دوسری
طرف گلشن کے تقاضے اس کے مصارف کا ایک معقول حصہ میرے ہی ذمہ
ایک روز میں کوئی دس بجے رات کو گلشن کے ہاں گیا سو ہاں نہ گلشن
کی ماں نہ اس کے سازندے، میں نے نوکر سے پوچھا۔

Colony
KARACHI

"کہاں گئیں؟"

"نواب صاحب کے ہاں"

"کیوں؟"

"مجرا ہے"

میرا غصہ کے مارے برا حال ہو گیا۔ میں طیش میں آکر واپس جانے ہی والا تھا کہ گلشن آ گئی، تھی بڑی مزاج وال اور سمجھدار، میرے تیور دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ گئی۔ کہنے لگی؛

"کیا بات ہوئی؟"

"تم مجرے میں جانا نہیں چھوڑو گی؟"

"میں آج چھوڑ دوں مگر آپ جب چھوڑنے دیں"

"کیا مطلب؟"

"اے ہے کتنے ننھے بچے بنے جاتے ہیں۔"

"کچھ کہو بھی تو"

"اماں کتنے دن سے آپ سے ایک ہزار روپیہ مانگ رہی ہیں"۔

"ابھی انتظام نہیں ہو سکا"

جب تک انتظام نہیں ہو گا۔ میرا مجرے میں جانا نہیں چھٹے گا۔ سمجھے؛ سن لیجیے خوب کان کھول کر۔"

"میں کل ہی روپیہ لاکر دے دوں گا"

"تو میں کل ہی سے مجرے میں جانا بند کر دوں گی"

اس گفتگو کے بعد میں واپس چلا آیا، اب یہ فکر ہوئی کہ روپیہ کا انتظام کہاں سے کروں، سو پچاس ہوتے تو کوئی بندوبست کر لیتا، لیکن یکمشت ایک ہزار یہ کہاں سے لاؤں؟ صبح ہوئی میں اسی فکر میں بیٹھا تھا۔ چچا نے طلب کیا میں پہنچا انھوں نے کہا بوٹا سنگھ اینڈ کمپنی کے ہاں چلے جاؤ یہ دو ہزار روپیہ دیدو اور کہو باقی دو ہزار آئندہ مہینے میں بھیج دیئے جائیں گے۔ میں نے بڑی سعادت مندی سے گردن ہلائی، روپیہ لیا اور چل دیا۔ ایک ہزار تو میں نے گلشن کی ماں کو دے دیا، باقی ایک ہزار میں ڈھائی سو کی ایک طلائی گھڑی، چار سو کی ایک بنارسی ساڑھی۔ تین سو کی ایک خوبصورت انگوٹھی خریدی۔ یہ سب سامان لے کر میں نے گلشن کے قدموں میں ڈال دیا، میری یہ سخاوت دیکھ کر وہ پھول کی طرح کھل گئی۔ اسے خوش دیکھ کر میں آپے سے باہر ہو گیا اس نے اپنی گوری گوری بانہیں میرے کالے کالے گلے میں حمائل کر دیں تاکید کی کہ آج یہیں رہنا کہیں جانے کا نام نہ لینا۔ میں نے کہا

؎ تم جسے یاد کرو، پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

گلشن کے ہاں یہ رات حاصل زندگی تھی، آج اس نے جتنی میری خاطر مدارات

کی جس جس طرح مجھے نوازا ، جس جس انداز سے میری دلدہی کی میرا دل جانتا ہے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

غالب نے یہ شعر شاعرانہ تصور سے کام لے کر کہا ہو گا۔ لیکن میرے لئے تو یہ امر واقعہ ہے کہ داستان شب، کیف و سرور، وجد و سرمستی رندی و مدہوشی سکر و جذب کی ایسی کیفیتیں اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ جو الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتیں، مختصر آ جگر کے الفاظ میں یوں سمجھئے۔

وہ ہم میں اور ہم ان میں سمائے جاتے تھے ،

رات گذر گئی، سپیدہ سحر نمودار ہوا، موذن نے اذان دی۔ گلشن بھی رات کی جاگی ہوئی تھی ، نیند سے بے قابو ہو کر سو گئی ۔ اس کی مخمور آنکھیں ، اس کا چاند سا چہرہ اس کی بلور کی سی چمکتی باہیں، اس کا رخ زیبا ۔ اس کی ملاحت و صباحت اب تک میری آنکھوں میں بسی ہوئی ہے ۔ وہ سو گئی ، میں اس کے رخ تاباں کا نظارہ کرتا رہا ، نظارہ کے دوران میں عالم یہ تھا کہ ع

نظارہ ز جنبیدن مژگاں گلہ دارد !

نظارہ کرتے کرتے میں بھی سو گیا ۔

کوئی بارہ بجے دوپہر کو ہم لوگ سو کر اٹھے ۔ غسل کیا ۔ آدمی نے ۔ کھانا کھایا ۔ گلشن نے مجھ سے وعدہ فردا لیا اور میں وہاں سے باچشم تر رخصت

ہوا، تھوڑی دیر کیلئے بھی مجھے اسکی جدائی شاق تھی۔

گھر پہنچا چچا کی غضبناک آنکھیں دیکھ کر میں سہم گیا۔ اُن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا معلوم ہوتا تھا وہ مجھے گولی ماردیں گے۔ چور کا دل کتنا میں گھبرا گیا، اُنہوں نے مجھ سے فرمایا۔

"تم نے بوٹا سنگھ اینڈ کمپنی میں دو ہزار روپے داخل کر دیئے تھے؟"

"جی جی ہاں، جی نہیں، جی ہاں، جی نہیں، جی ہاں، جی۔۔۔۔۔"

"کیا بکتا ہے صاف صاف کیوں نہیں کہتا"

"جی ہاں دے دیئے تھے"

"رسید کہاں ہے؟"

"وہ تو کہیں راستہ میں گم ہوگئی"

"جھوٹا، بدمعاش، خبیث" یہ کہہ کے جو چچا نے گرجنا برسنا شروع کیا ہے، کہ خدا کی پناہ، آج پہلی اور آخری بار اُنہوں نے اپنی آبنوس کی چھڑی سے مجھے مارا، اتنا مارا کہ وہ خود مارتے مارتے بے حال ہوگئے۔ اندازہ فرمالیجئے جب اُن کی یہ کیفیت ہوئی تو میرا جو تختۂ مشق ستم بنا ہوا تھا کیا حال ہوا ہوگا؟

وہ تو مجھے مار ڈالنے کے لئے پستول نکال لائے تھے، لیکن چچی جو مجھے بہت چاہتی تھیں آڑے آگئیں چچا ان کے کہنے سے باز آگئے۔

اب میرے لئے نا ممکن تھا کہ چچا کے ہاں رہوں۔ نہ وہ اسے گوارا کر سکتے تھے، نہ میں اسے پسند کر سکتا تھا، پھر اب کیا کروں؟ مجھ میں یہ قابلیت بھی نہیں تھی کہ کسی کمپنی یا دفتر میں کلرکی کر سکتا اور ۳۰، ۴۰ روپیہ ماہوار کما لیتا۔

روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر!

پھر کیا کروں؟ دوسری فکر گلشن کی تھی، اُسے کتنی مشکلوں سے میں نے اپنایا تھا، اُسے کتنی گراں قیمت پر میں نے اپنا بنایا تھا، اب اس کے ہاں کس طرح جاؤں گا؟ خالی ہاتھ جاؤں گا تو نکال دیا جاؤں گا۔ جیب بھر کے جاؤں تو یہ ممکن نہیں۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ ایک دوست سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا کس فکر میں مبتلا ہو؟ میں نے از اوّل تا انتہا سارا ماجرا انہیں سُنایا۔ انہوں نے کہا گھبرا گئے کیوں ہو تمہیں تو بڑی آسانی سے نوکری مل جائے گی، میں نے کہا کہاں؟ کیسے؟ انہوں نے کہا میونسپلٹی میں خان بہادر اشرف علی خاں سفارش کر دیں تو آج رکھ لئے جاؤ، میں نے کہا میری قابلیت تو تم جانتے ہی ہو۔ میں تو وہاں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا انہوں نے کہا ارے بھئی، میں نے "جمعدار صفائی" کے لئے کہا تھا۔ یہ کام تو تم بہت اچھی طرح کر لو گے۔ گندگی، بدبو، میلے پن کو تمہاری نظر اس طرح پکڑ لیتی ہے، جیسے چیل آسمان کی بلندی سے بوٹی دیکھ لیتی اور ایک

چھپٹے میں اُسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

میں نے کہا میں تمہیں اپنا ہمدم اور دمساز سمجھ رہا تھا یہ نہیں معلوم تھا کہ تم میرا مذاق اڑانے لگو گے، آہ سچ ہے سے

اہلِ دُنیا ہیں فقط صورت شناس روزِ عیش
شامِ غم کی تیرگی میں کون کس کا آشنا

وہ ہنسنے لگے کہنے لگے یار بُرا مان گئے؟ اس میں خفا ہونے کی کونسی بات تھی؛ اچھا اگر وہ جگہ نہیں منظور ہے۔ تو دُوسری جگہ بتاتا ہوں وہاں کوشش کرو۔ مہاراجہ سورج پور کو ایک خوبصورت ایڈی کا نگ کی ضرورت ہے، آج ہی کے اخبارات میں اُن کا اشتہار چھپا ہے، تم بھی اپنی درخواست بھیجدو تنخواہ بھی معقول ملے گی، یہاں سے سورج پور زیادہ دُور بھی نہیں ہے۔ جب چاہنا آنا، گلشن سے ملنا اور پھر واپس چلے جانا، آمدنی زیادہ ہو جائے تو گلشن کو بھی وہاں بُلا لینا۔

میں نے اس ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور کہا، لیکن میں خوبصورت کب ہوں؛ سودا نے اپنے ہجویہ قصیدوں میں جس تیرہ دروں اور سیاہ رو کی تصویر کھینچی ہے۔ وہ بالکل میرے مطابق ہے، انہوں نے کہا مہاراجہ کو مرزا پھویا کی ضرورت نہیں ہے۔ خوبصورت سے مطلب ہے تنومند، قد آور اور مناسب ڈیل ڈول کا آدمی، یہ بات میرے دل کو لگ گئی۔ دُوسرے ہی دن میں نے

درخواست بھیجدی۔

ایک ہفتہ کے بعد سورج پور سے جواب آیا، مہاراجہ کے پرائیویٹ سکریٹری نے مجھے انٹرویو کے لئے طلب کیا تھا، خط پاتے ہی میں روانہ ہو گیا گسٹ ہاؤس میں مقیم ہوا۔ سب سے پہلے سکریٹری صاحب کے درشن ہوئے۔ بڑی بے تکلفی سے ملے، کہنے لگے امید ہے کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ آپ میں وہ تمام باتیں دکھائی دیتی ہیں، جن کی مہاراجہ کو ضرورت ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا وہ کیا باتیں ہیں؟ وہ مسکرایا مجھے چند لمحوں تک گھورا پھر مسکرایا، کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا معلوم ہو جائے گا وہ یہ کہہ کے چلا گیا اور میں پریشانی کے دریا میں غوطے کھانے لگا کہ ظالم کیسی پہیلی کہہ گیا ہے؟

دو روز تک خوب مہمانداری کا لطف میں نے اٹھایا، تیسرے روز مہاراجہ صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں اب تک بڑے بڑے رئیسوں اور دولتمندوں سیٹھوں اور ساہوکاروں سے مل چکا تھا۔ لیکن کسی مہاراجہ سے ملنے کا مجھے آج تک اتفاق نہیں ہوا تھا، میرا دل دھڑک رہا تھا، پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ حواس کھوئے کھوئے سے تھے۔ میں مہاراجہ کے سامنے پہنچا۔ جھک کے فرشی سلام کیا۔ مہاراجہ اس کمرے میں تنہا تھے۔ اب اُن کا پرائیویٹ سکریٹری بھی آ گیا تھا۔ انہوں نے سکریٹری کی طرف دیکھ کر، بلکہ اُسی سے مخاطب

ہو کر کہا، ان سے پوچھو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ؛ سکریٹری صاحب نے یہی الفاظ رک رک کر دہرائے۔ میں نے پھر تعظیمی سجدہ کیا۔ اور عرض گذار ہوا، خدا مہاراجہ کا آفتاب اقبال ہمیشہ روشن اور تاباں رکھے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مہاراجہ کے درشن ہوئے۔ زندگی بھر فخر کروں گا اگر مجھے غلاموں کے حلقوں میں شامل کر لیا گیا، مہاراجہ صاحب کے منہ پر تبسم کھیلنے لگا۔ انہوں نے اپنے سکریٹری سے کہا "یہ ملازم رکھ لئے گئے" اب کے سکریٹری نے سر جھکایا۔ پھر فرمایا "آپ انہیں تفصیلات بتا دیجئے" اس نے پھر سر جھکایا۔ میں تو سر جھکائے کھڑا ہی تھا۔ یہ دو کلمے کہہ کے مہاراجہ صاحب اندر چلے گئے۔ میں سکریٹری کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔

باہر آکر سکریٹری صاحب نے پوچھا۔

"کہئے اب تو آپ خوش ہو گئے"

"آپ کی بندہ نوازی ہے"

"دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ علاوہ ازیں قیام و طعام کے مصارف ریاست کے ذمہ ہوں گے"

میرا چہرہ کھل اٹھا۔ میں نے بہ فور مسرت میں بے ساختہ سکریٹری صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔ میں نے پوچھا میرے ذمہ کام کیا ہوں گے ؟ فرمایا مہاراجہ کو خوش رکھنا، ان کے ہر ارشاد کی تعمیل کرنا۔ سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہنا۔

اُلّو کی طرح رات بھر جاگنا چمگادڑ کی طرح دن بھر سونا۔ یہ پروگرام سُن کر ذرا میں چونکا ہُوا۔ پھر خیال آیا نوکری کرنی ہے، تو یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔

میری یہ ملازمت عجیب ملازمت تھی، بقول سکریٹری صاحب کے رات بھر اُلّو کی طرح جاگنا اور دن بھر چمگادڑ کی طرح سونا۔ چھٹی کسی دن نہیں۔ ۱۱ بجے رات کو مہاراجہ کی مجلس جمتی تھی، اور صبح کے چار بجے تک جاری رہتی تھی۔ یہ پرائیویٹ مجلس ہوتی تھی، مہمات ریاست، معاملات مملکت، اور تصفیہ طلب احکام و فرامین جب کبھی مہاراجہ کو دوسرے کاموں سے فرصت ہوتی تھی پیش ہوتے تھے، رات کی مجلس میں تو صرف خوش گپیاں ہوتی تھیں حسن و جمال پر تبصرے ہوتے تھے، حُسن و عشق اور محبت کی گھاتوں کا چرچا ہوتا تھا، حرص و ہوس کے نئے نئے نقشے بنائے جاتے تھے۔ اور انہیں عمل میں لانے کی تجویزیں پیش ہوتی تھیں۔

ایک روز ایک مصاحب نے کہا: "حضور آج کل تو گلشن کا ڈنکا بج رہا ہے۔"

"یہ گلشن کون؟"

"ایک طوائف ہے سرکار"

"بہت خوبصورت؟"

"سرکار چندے ماہتاب چندے آفتاب"

"پھر اُسے یہاں لاؤ"

"اشارہ کی دیر ہے سرکار کل ہی آجائے گی"

"کل نہیں آج"

"بہت اچھا سرکار"

یہ باتیں سُنکر میرا خون خشک ہوا جا رہا تھا۔ گلشن جس سے میرے اُجڑے ہوئے دل کی دُنیا آباد تھی۔ جو میری دُنیائے تمنا تھی، جس کے لئے میرا عقیدہ تھا ؎

چاہیں تو تم کو چاہیں دیکھیں تو تم کو دیکھیں
خواہش دلوں کی تم ہو آنکھوں کی آرزو تم

وہ گلشن اب مہاراجہ کا کاشانۂ عشرت آباد کرے گی؟ ان حرص و ہوس کے بندوں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے گی؟ ان نفس پرستوں، ان دون فطرتوں، ان بدمعاشوں کا تختۂ مشق بنے گی۔ میرا جی چاہا کہ مہاراجہ سے کہوں،

ع — یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے؛

لیکن میں خاموش رہا۔ مجھے یقین تھا۔ گلشن یہاں نہیں آئے گی۔ کبھی قیمت پر نہیں آئے گی۔ ہرگز نہیں آئے گی۔ اُسے میں نے سمجھا رکھا ہے، یہ راجے مہاراجے تم عورتوں کی آبرو بھی لیتے ہیں اور جان بھی!

دربار میں قہقہوں اور چہچہوں سے کیف و سرور کا عالم چھایا ہوا تھا

کوئی کسی پر پھبتی کس رہا تھا، کوئی کسی کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ کوئی بھانڈوں کی طرح نقلیں اُتار رہا تھا، کوئی حاجی لقلق کی طرح نقل محفل بنا ہوا تھا، اسی صدائے ہائے ہو اور آواز نوشا نوش میں رات کے دو بج گئے، وہی مصاحب خراماں خراماں آتا دکھائی دیا۔ مہاراجہ نے پوچھا "کیا خبر لائے ہو"

"حضور کے غلام کبھی ناکام نہیں رہتے"۔

"گلشن آگئی ؟"

"آگئی سرکار"

"حاضر کرو"

تھوڑی دیر میں محشر بداماں گلشن بھی آگئی، اُسے دیکھ کر مجھ پر سکتہ کا عالم طاری ہوگیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے منہ پر دو ہزار جوتے بغیر گنے ہوئے مار دیئے۔ گلشن نے مجھے دیکھا۔ میں نے اُسے دیکھا اس نے اس طرح جیسے وہ مجھے پہچانتی ہی نہیں۔ میں نے اس طرح گویا میری کائنات اسی میں سمٹ کر سما گئی ہے۔ مہاراجہ نے مجھے نہیں دیکھا، صرف گلشن کو دیکھا دیکھتے رہے پھر فرمایا،

"تم آگئیں"

"آگئی سرکار"

مہاراجہ مسکراتے ہوئے اُٹھے، گلشن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا، اور خراماں

خراماں اپنے قصرِ خواب میں چلے گئے۔ جلسہ برخاست ہوگیا، میں بھی اُٹھا
اپنے کمرہ میں جاکر گنگنانے لگا،

"شبِ غم کی سحر نہیں ہوتی"

ساری رات میں نے جاگ کر کروٹیں بدل بدل کر کاٹی۔

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

میں سوچتا تھا گلشن کے تمام وعدے کیا ہوئے؟

وہی وعدہ یعنی نباہ کا، اُسے یاد ہو کہ نہ یاد ہو!

اسی اختر شماری میں صبح ہوگئی۔ اُٹھا غسل کیا، ناشتہ سے فارغ ہوا
پھر شیش محل کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اسی محل میں گلشن ٹھہرائی گئی تھی، وہاں پہنچ
تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ کے قصرِ عشرت سے ابھی وہ واپس نہیں آئی ہے،
کی ماں سے ملاقات ہوئی بہت بہت اکھڑی باتیں کرتی رہی کہنے لگی۔

"بھیا تم یہاں کہاں؟"

"جہاں آپ وہاں میں"

"یہ ریاست کا معاملہ ہے"

"تو"

"اونچ نیچ ہو تم جانو،

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"اُو بچ بیچ کیا ہو گی ؟"

"مہاراجہ کو کسی نے خبر کر دی تو ؟"

"کیا خبر کرے گا ؟"

"یہی کہ تم یہاں آتے ہو ؟"

"تو کیا ہو گا ؟"

"ہم تو اپنی روزی سے جائیں گے انہیں کیا گھر نہ سہی جیل سہی ۔"

"تو میں چلا جاؤں ۔"

"ہاں چلے جاؤ اب کبھی نہ آنا ۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ گلشن آ گئی اس نے نیچی نظروں سے مجھے دیکھا پھر پوچھا ۔

"آپ یہاں کس کی اجازت سے آئے ہیں ؟"

"کیا یہاں آنے کے لئے اجازت کی ضرورت ہے ؟"

"جی ہاں ۔"

"کب سے ؟"

"جب سے میں یہاں آئی ہوں ۔"

"گلشن یہ باتیں تم کر رہی ہو ؟"

"آپ بیکار باتیں نہ کیجئے اچلے جائیے ۔"

"چلا جاؤں"

"ہاں"

گلشن کا یہ طرزِ عمل، یہ اندازِ گفتگو، یہ بے پروایانہ سلوک، میرے لئے کچھ کم تکلیف دہ نہیں تھا، کہ اتنے میں غضب یہ ہوا، مہاراجہ صاحب خود بہ نفسِ نفیس آن موجود ہوئے۔ مجھے اُنہوں نے گھور کر دیکھا، برہمی کے ساتھ پوچھا،۔

"تو یہاں کہاں"

میں سٹ پٹا گیا، ابھی کوئی جواب بھی نہیں سوچ پایا تھا کہ گلشن مسکراتی ہوئی آگے بڑھی، مہاراجہ کا ہاتھ اپنے دستِ نازک میں لیا۔ اور کہنے لگی۔

"یہ؟ میرے عاشق ہیں!"

"یہ بات ہے؟"

"جی سرکار، یہاں اسلئے آئے تھے کہ مجھے منع کریں کہ تو یہاں کیوں آتی ہے؟ کیوں رہتی ہے؟ بھاگ جا! یہ راجے مہاراجے اژدہے ہیں، تجھے کچا چبا جائیں گے۔"

"اچھا"

"جی سرکار" بڑی بڑی نصیحتیں کر رہے تھے کہہ رہے تھے تو میرے ساتھ بھاگ چل، یہ مہاراجے عیاشی جانتے ہیں، محبت نہیں جانتے

ہوس رانی جانتے ہیں، عشق کی قربانیاں نہیں جانتے، حسن کا سودا کرنا جانتے ہیں اپنے تئیں بے داموں بیچنا نہیں جانتے، جوانی کا لوٹنا جانتے ہیں، زندگی کا لٹانا نہیں جانتے، کھیلنا جانتے ہیں۔ زندگی کا نباہ کرنا نہیں جانتے۔"

"پھر تم نے کیا کہا گلشن؟"

ہیں تے؛ میں نے کہا ہو نگے راجے مہاراجے، ایسے میرے سرکار تو ایسے نہیں ہیں۔"

"پھر یہ نمک حرام کیا بولا؟"

"منہ چڑھانے لگا سرکار، شاید گالیاں بھی دیتا، اتنے میں حضور آگئے"

"یہ ہمت"

یہ کہہ کر انتہائی برہمی کے عالم میں مہاراجہ نے مجھے دیکھا تالی بجائی، بارہ نوجوانوں کا ایک مسلح دستہ زرق برق لباس سے آراستہ پیراستہ سامنے نمودار ہو گیا۔ مہاراجہ نے میری طرف دیکھ کر اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا "چٹ پٹ" یہ کہکر وہ تو گلشن کو لے کر "آئینہ خانے" میں چلے گئے۔ اور میں حراست میں لے لیا گیا۔

مجھے ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں لیجایا گیا، اس کے بعد جو کچھ ہوا الفاظ اس کے بیان کے متحمل نہیں ہو سکتے، تصور کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہے چیخیں مار مار کر رونے کا جی چاہتا ہے

میں لہو لہان اس کوٹھڑی سے برآمد ہوا، میری جیب میں ۵۰ روپیہ کا ایک نوٹ رکھدیا گیا۔ میرا تمام سامان، تمام فرنیچر، تمام کپڑے ضبط کر لئے گئے اور بیک بینی و دو گوش موٹر میں بٹھا کر حدود ریاست کے باہر ایک ویران و سنسان مقام پر اُتار دیا گیا۔

میں گرتا پڑتا پھر چچا کے ہاں پہنچا، اور وہیں ڈیرہ ڈال دیا، اب

ع ـــ: پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیّاد کا گھر

لیکن مجھ سے نچلا تو بیٹھا نہیں جا سکتا تھا، کچھ روز تک چچا کے ہاں رہا، بلکہ وہاں میرے ساتھ نہایت حقارت آمیز برتاؤ ہو رہا تھا، پھر میں وہاں سے چلا گیا اور کئی رجواڑوں کی سیر کی کہیں کچھ دنوں کے لئے ملازم ہو گیا کہیں بطور مہمان کے رہا۔

آخر ایک روز نہ جانے بیٹھے بیٹھے کیا جی میں آئی کہ مہاراجہ کو میں نے ایک تو یہ نامہ لکھ کر بھیجدیا۔ اور پھر فوراً،

ے حالِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

پر عمل کرنے کے لئے یہاں پہنچ گیا۔

کئی روز تک پڑا رہا، حاضری کا موقعہ نہیں ملا، پرسوں نظر چار ہو گئی میرے گناہ بخش دیئے گئے اور میں اب کی پہلے سے بھی ترقی کر گیا

صرف مصاحب تھا اب پرائیویٹ سکریٹری ہوں''۔

لوگوں نے پوچھا "گلشن کیا ہوئی"؟

"گلشن؟ اس دنیا میں پہنچا دی گئی جہاں نہ بہار ہے نہ خزاں آہ،

"حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے"۔

یہ کہتے کہتے مرزا صاحب کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۱۲)

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

ہمارے دیس میں، راج ہٹ، تریا ہٹ اور بالک ہٹ مشہور کہاوت ہے۔ بچہ اپنی ضد پوری کر کے رہتا ہے، عورت اپنی ضد پر اڑ جائے تو چٹان بن جاتی ہے، دنیا کی کوئی قیمت اسے ہلا نہیں سکتی، کوئی راجہ صاحب ضد فرمائیں تو کس کی مجال ہے کہ سنگِ راہ بن سکے؛ جو راستہ کا روڑا بنے کی کوشش کرے وہ سرمہ کی طرح پیس دیا جائے۔

ریاست میں ایک حادثہ ایسا پیش آیا کہ راج ہٹ اور تریا ہٹ

مقابلہ ہو گیا، اور مقابلہ بھی وہ زبردست کہ چشم فلک نے اسکی نظیر نہ دیکھی ہوگی،

ہوا یہ کہ مہاراجہ صاحب شیر کا شکار کھیلنے تشریف لے گئے، ایک گاؤں لشن پور میں پڑاؤ ہوا، مہاراجہ کے درشن کو سارا گاؤں ٹوٹ پڑا، دیہاتی ابتک اپنے راجہ کو اوتار سمجھتے ہیں اس کے درشن کر لینا ان کے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔

مہاراجہ صاحب بندوق ہاتھ میں لئے شکاری لباس میں ملبوس خراماں خراماں تشریف لئے جا رہے تھے، پیچھے پیچھے دو چار مصاحب تھے وہ بھی بندوقوں سے مسلح تھے، سامنے تالاب تھا ایک لڑکی وہاں پانی بھرنے آئی تھی۔ جب مہاراجہ قریب پہنچے، اس نے گھونگٹ کاڑھ لیا، ایک مصاحب آگے بڑھا، لڑکی کے سامنے پہنچا، اور بے کچھ کہے سنے چلو باندھ کر کھڑا ہو گیا، اس حرکت پر مہاراجہ صاحب مسکرائے، مصاحبین کو موقع مل گیا، وہ زور سے ہنسنے لگے لڑکی گھبرائی تو اس کے ہاتھ سے گھڑا چھوٹ گیا، اور سارا پانی بہہ گیا، وہ ٹوٹا ہوا گھڑا سمیٹنے کے لئے جھکی تو اس کا پلو ہوا میں اڑا، اور چہرہ بے نقاب ہو گیا، نہیں یوں کہیئے چاند گہن سے نکل آیا، مہاراجہ صاحب ٹھٹھکے، انہوں نے ملاطفت لیکن رعب کے ساتھ پوچھا۔

"پہچانتی ہے ہمیں تو؟"

"سرکار ان داتا ہیں، سرکار کو نہ پہچانوں گی"

"نام کیا ہے تیرا؟"

"رانی!"

"رہیں جھونپڑے میں اور خواب دیکھیں محلوں کا"

ایک مصاحب نے برجستہ عرض کیا، رانی نے گردن جھکا دی، راجہ کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگا پارٹی آگے بڑھ گئی۔

رات کو مہاراجہ صاحب اپنے خیمہ میں بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے، چند منہ چڑھے مصاحب حاضر تھے، ایک نے پوچھا۔

"حضور کچھ سوچ رہے ہیں"

دوسرا بولا۔

"حضور کسی فکر میں ہیں"۔

تیسرے نے کہا۔

"سرکار ہمیں اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ کوئی حکم دیں"۔

"نہیں یہ بات تو نہیں ہے" مہاراجہ نے کہا، کچھ دیر وہ خاموش رہے

پھر انہوں نے فرمایا،

"خوب تھی یہ لڑکی رانی بھی"

"خوب! اے حضور وہ تو پرستان کی پری تھی"۔

"گودڑ کا لال"

"چہرہ پر چمک کس غضب کی ہے آنکھیں نہیں جمتیں"۔

"وہ حسن نہیں نام خدا اور ہی کچھ ہے"۔

باری باری سے ہر ہر مصاحب نے، اس طرح اظہار خیال کیا، مہاراجہ صاحب اپنے ان مصاحبین پر بڑا بھروسہ کرتے تھے، اسی لئے یہ لوگ کسی حد تک ان کی جناب میں گستاخ بھی تھے، مہاراجہ کی تمام پرائیویٹ اسکیمیں اسی مجمع میں پیش ہوتی تھیں ان پر مباحثہ ہوتا تھا، پھر وہ منظور ہوتی تھیں۔

ایک مصاحب نے مہاراجہ کا عندیہ پا کر کہا تو حضور اسمیں فکر کی کونسی بات ہے، آجائے گی رانی حضور کے قدموں میں،

مہاراجہ صاحب خاموش رہے، گویا انہوں نے منظوری دیدی،

رانی کی عمر ۱۸، ۱۹ سال کی تھی، اسکی شادی کم سنی ہی میں پرکاش سے ہو چکی تھی، اب دونوں جوان تھے، ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ سکھ اور چین کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان دونوں کی زندگی، غربت کے باوجود اطمینان آسودگی، عافیت، اور مسرت کی زندگی تھی، سچی محبت کانٹوں کو بھی پھول بنا لیتی ہے، رانی اور پرکاش کی زندگی میں بہت سے کانٹے تھے۔ غربت، تنگدستی، فلاکت . . . . . لیکن ان دونوں کی محبت نے ان کانٹوں کو بھی پھول بنا لیا تھا۔

دوسرے روز مہاراجہ کا شکار ختم ہو گیا اور وہ سورج پور روانہ ہو گئے،

ان کے جاتے ہی لشن آپور کی وہ رونق وہ گھما گھمی بھی ختم ہو گئی۔
سورج پور پہنچنے کے تیسرے روز رانی "راج بھون" میں پہنچ گئی اسے
دیکھتے ہی مہاراجہ پھول کی طرح کھل گئے، انہوں نے اسے مخاطب کرکے فرمایا،

"رانی تم اپنے محل میں آگئیں"؛

"دہائی ہے حضور کی"

یہ کہکر وہ زار زار مثل ابر نو بہار رونے لگی۔

"ارے تم روتی ہو؟"

"سرکار مجھے لشن آپور پہنچا دیجئے"

"یہ کیوں؟"

"مجھے وہیں سکھ ہے"

"اور یہاں؟"

"یہاں میں مر جاؤں گی؟"

"پرکاش کی محبت میں"۔

"ہاں مہاراج، وہ میری جان ہے"۔

"تمہیں یہیں رہنا پڑے گا"

یہ کہکر مہاراجہ صاحب چلے گئے۔

ان کے تشریف لیجانے کے بعد، رانی کو سمجھانے بجھانے کے لئے، ایک

عملہ متعین ہوگیا، کوئی اسے "رانی" [illegible] یہ رنگ دیکھ کر محافظ تھرا اٹھا باغ دکھا رہا ہے، کوئی نافرمانی کے عذاب الیم کی اسے بشارت دے رہا ہے،

رانی نے عجیب طریقہ اختیار کر رکھا تھا، اسکی زبان بند تھی، آنکھیں گنگا اور جمنا کی تراوش کر رہی تھیں، اس کی نظر میں مہاراجہ صاحب کی یہ دولت، ان کا شاہانہ اجلال و اکرام، ان کا یہ قصر فلک بوس، ان کے غیر محدود اختیارات سب بے معنی تھے، وہ نہ کسی سے مرعوب تھی، نہ متاثر، وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ لشن پور پہنچا دی جائے، وہیں جہاں اس کا پرکاش ہے۔ جہاں اس کا چین اور سکھ ہے، جہاں اسکی روح اور جان ہے، محل کے خدمتگار اس کے لئے آسمان کے تارے توڑ کر لا سکتے تھے دنیا کی ہر چیز حاضر کر سکتے تھے، لیکن یہ نہیں کر سکتے تھے کہ اُسے لشن پور پہنچا دیں۔

اسی طرح دو مہینہ کی مدت گذر گئی۔

ایک روز مہاراجہ صاحب تشریف لائے، رانی ملزم کی طرح حاضر تھی، اس کے محافظ اور نگہبان خون آشامی کی پوری شان کے ساتھ موجود تھے مہاراجہ کے تشریف لاتے ہی سناٹا چھا گیا۔

مہاراجہ نے ایک نگاہِ غلط انداز رانی پر ڈالی، پھر اپنے چہرہ آثار غضب طاری کئے، پھر ارشاد فرمایا — رانی کی طرف دیکھ کر نگہبان سے

......

ان کے جاتے ہی لشن پور کی وہ رونق"

"حضور یہ چھوکری اپنی ضد پر قائم ہے"

"ہر منتر بیکار ہوا؟"

"جی سرکار"

"ہار مان لی تم نے؟"

"عجیب چھوکری ہے یہ کسی کی سنتی ہی نہیں"

"تم بے بس ہو گئے، تم سے کچھ نہ ہو سکا؟ حسن کی بارگاہ میں تم نے سر جھکا دیا؛ تمہاری وہ شقاوت کیا ہوئی جس کے ڈنکے بجا کرتے تھے؛ وہ تمہاری سفاکی کدھر گئی جس پر تمہیں ناز تھا؛ ایک عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تم نے؟"

"سرکار یہ بات تو نہیں ہے!"

"پھر کیا بات ہے، کہو، ذرا ہم سنیں"

"بات یہ ہے کہ عورت سے زبردستی کیے بنتی نہیں۔

"تو صاف صاف کہو ہار گئے تم"

یہ کہہ کر مہاراجہ صاحب نے جواب کا انتظار نہیں کیا، اب وہ سراپا غیظ و غضب بنے ہوئے تھے، آنکھوں سے دہکتے ہوئے شعلے نکل رہے تھے چہرہ انور گلنار بنا ہوا تھا، بدن کا ایک ایک رواں، دست بستہ کھڑا ہوا

تھا، اور وفورِ ہیبت سے تھر تھرا رہا تھا، یہ رنگ دیکھ کر محافظ تھرا اٹھا نگہبان کانپ گئے، لیکن رانی اسی بے پروائی کے انداز سے کھڑی ہوئی تھی

مہاراجہ نے ایک خادم کو حکم دیا، کیلیں اور ہتھوڑا لاؤ، اس حکم کی تعمیل ہوئی، ایک چوبی تختہ پر نیم عریاں حالت میں رانی لٹا دی گئی، اور حکم دیا گیا کہ اس کے ہاتھ تختہ پر کیلوں سے جڑ دیئے جائیں، کیلیں موجود تھیں ہتھوڑا حاضر تھا، فوراً تعمیل شروع ہو گئی ہر ہر ضرب پر رانی بلبلاتی تھی، تڑپتی تھی، مرغِ بسمل کی طرح پھڑکنے کی کوشش کرتی تھی، ہر ہر ضرب پر محافظ پوچھتا تھا، بول اب بھی مہاراجہ کا کہنا نہیں مانے گی؛ اب بھی ان کی حکم عدولی کرے گی؛ اب بھی ان کی حکم عدولی کرے گی؛ اب بھی ان کے حکم پر گردن نہیں جھکائے گی، ہر ہر ضرب پر وہ مہاراجہ کو صلواتیں سناتی تھی، محافظ کو گالیاں دیتی تھی، یہاں تک کہ وہ بیہوش ہو گئی۔ کارروائی ملتوی ہو گئی۔

اب پرکاش بھی گرفتار ہو کر آ گیا تھا، اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی اس سے مطالبہ یہ تھا کہ وہ رانی کے سامنے جائے، اور کہدے، میں تجھے نہیں چاہتا، میں نے تجھے چھوڑ دیا، میرا خیال دل سے نکال دے، لیکن وہ اپنے انکار پر قائم تھا، اس پر کوڑے پڑ رہے تھے، جوتوں سے اس کی تواضع کی جا رہی تھی، ٹھوکروں اور لاتوں سے اس کی عزت افزائی ہو رہی تھی، لیکن رانی میری جان ہے، میں اسے نہیں چھوڑ سکتا" اس کے سوا اس کے منہ

سے کچھ نکلتا ہی نہیں تھا ،

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ، جب ان دونوں کو ذرا ہوش آتا تھا ، الگ الگ تعزیر و عقوبت کا سلسلہ جاری تھا ، آخر فیصلہ کن گھڑی سر پر آن پہنچی ،

ایک کمرہ میں نڈھال پرکاش دست بستہ کھڑا ہوا تھا ، وہیں مجبور و رانی بھی لائی گئی - دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ، اور دیکھتے ہی سب کچھ سمجھ لیا - ؎

قاصد یہ تیرا کام نہیں اپنی راہ لے
اسکا پیام دل کے سوا کون لا سکے ؟

رانی کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ، پرکاش کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں ، لیکن بہ نہیں رہی تھیں -

اسی اثنا میں مہاراجہ صاحب کی سواری بادبہاری آئی ، آج ان کے چہرہ پر غصہ کی شکن نہیں تھی ، تبسم کی رعنائی تھی ، شاہانہ وقار کے ساتھ آہستہ آہستہ خراماں خراماں ، وہ تشریف لائے اور بیٹھ گئے ، انہوں نے رانی سے کہا ،

"آگیا تیرا پرکاش "

"ہاں مہاراج "

"جائے گی اس کے ساتھ ؟"

"جاؤں گی سرکار"

"بہت پیار کرتی ہے اسے ؟"

رنجور اور مجروح رانی نے شرم سے گردن جھکالی،

اتنے میں دھماکہ ہوا، اُس نے آنکھ اُوپر اُٹھائی۔ پرکاش مقتول پڑا ہوا تھا، پستول مہاراجہ کے ہاتھ میں اپنی آب و تاب دکھا رہا تھا، رانی اپنے حواس درست کر کے کچھ کہنے نہیں پائی تھی کہ مہاراجہ کی آواز فضا میں بلند ہوئی۔

"پرکاش کے پاس جائے گی یا اس محل میں رہے گی رانی بن کر؟"

"پرکاش کے پاس جاؤں گی،"

"تو مرنا چاہتی ہے؟"

"ہاں اب میں موت سے نہیں ڈرتی!"

"میں پھر تجھے موقعہ دیتا ہوں خوب غور کر لے"،

"میں خوب سوچ چکی"

اتنے میں پھر دھماکا ہوا، اور رانی کا تڑپتا ہوا جسم نیم جان، پرکاش کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب پڑے ہوئے تھے لیکن اتنے بے خبر تھے کہ گویا، ایک دوسرے کو پہچانتا بھی نہیں، نہ رانی پرکاش سے باتیں کر رہی تھی، نہ پرکاش اسے چھیڑ رہا تھا، وہ تھی

زندگی، یہ تھی موت،!

اس کارِ اہم سے فارغ ہو کر مہاراجہ صاحب واپس چلے گئے
ان کے جانے کے بعد، نگہبانوں اور محافظوں نے ان دونوں کی مٹی
لگا دی ٭

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

GLOBE LIBRARY
160/3, Bihar
Colony,
KARACHI.

باب

(۱۳)

دلچسپ سزا

مہاراجہ کے محل میں، عورتوں کی کمی نہیں تھی، ان کے محل کو اگر مہاراجہ اندر کے پرستان سے تشبیہہ ہی جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا جس طرح ایک تاجر اپنی دوکان کو ہر طرح کی دیدہ زیب چیزوں سے سجاتا ہے، اسی طرح ان کا محل صنفِ جمیل کے نازک اور دلکش، نظر فریب اور تقویٰ شکن، ہوش ربا، اور جنت نگاہ نمونوں کا "میوزیم" بنا ہوا تھا، حسن و جمال کی وہ کونسی قسم تھی جو

وہاں نہیں تھی، ایک ہوشیار جوہری، ہر طرح کے نگینے اپنے پاس رکھتا ہے،
اور ان کی مستقل قدر قیمت بھی رکھتا ہے، اسی طرح مہاراجہ کے بشیش محل
میں یاقوت اور زمرد، نیلم اور پکھراج، لعل بدخشاں اور دُرِ نا سفتہ ..
چلتے پھرتے، زندہ اور زندگی بخش، قاتل، اور زہر ہلاہل . . . .
سب ہی موجود تھے، کوئی معمولی آدمی نہیں تھے کہ جو مل گیا اسپر قناعت
کر لی، وہ جوہری تھے اور بڑی اچھی پرکھ رکھتے تھے، ایک نرشا نگینہ دیکھا
پسند آیا، اُسے اپنے خانۂ دل میں رکھا، اور اسکی آب و تاب، اسکی چمک دمک
سے لطف لیتے رہے، اس سے جی بھر گیا، کسی دوسرے پتھر کو بت بنا کر
دلمیں رکھ لیا، اور سارا جذبۂ عبودیت اس پر نچھاور کر دیا، جب اس سے
طبیعت اکتائی اُسے پھینک دیا، اور اس کے بجائے کسی اور کو خانۂ دل کا
مکیں بنا لیا۔

قدرت کے پیدا کئے ہوئے ہیروں اور موتیوں میں وضعداری ہوتی ہے
وہ جیسے بن گئے، بن گئے، ان کی جو قیمت ہو گئی ہو گئی، لیکن مہاراجہ اتنے
بڑے جوہری تھے کہ وہ کہ وہ خود بھی ہیرے اور جواہر بناتے رہتے تھے، خاک
کے ذروں کو اُٹھایا اور ہیرا بنا دیا۔

جس ذرہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا!

پھر جب جی چاہا جگمگاتے ہوئے ہیروں کو اُٹھایا اور خاک میں ملا دیا

جنہیں خاک میں ملا دیا، وہ دو کوڑی کے نہ رہے، جنہیں خاک سے اُٹھا کر پاک کر دیا، اُن کی قیمت کا کوئی اندازہ نہ کر سکا۔

ع۔ نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز

مہاراجہ کے محل میں ایک خادمہ تھی، موروثی خادمہ! نام تھا اس کا ہیرا۔

ع۔ بر عکس نہند نام زنگی کافور

ضرورت سے زیادہ موٹی، شب دیجور کی طرح کالی، آنکھیں اتنی چھوٹی کہ

ع۔ ہر چند کہیں کہ ہیں، نہیں ہیں

محل کے نوکر بھی اسے نگاہِ التفات سے نوازتے تھے، تو احسان عظیم سمجھ کر وہ جوان تھی، اور جوانی جب آتی ہے، تو کسی نہ کسی حد تک کافرانہ اور مستانہ اداؤں کی حامل بھی ہوتی ہے، مہاراجہ کی اس پر نظر پڑی، اُن کی جوہر شناس نگاہوں نے نہ جانے اس میں کیا کمال دیکھا کہ لٹّو ہو گئے۔

وہی ہیرا، جو کل تک سنگریزے سے زیادہ بے قیمت تھا، آج ہیرے کی طرح اپنی چمک دمک سے آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا، کل تک اس سے معمولی نوکر بات کرتے تھے، تو تلخی اور درشتی کے ساتھ، آج اس سے بڑے بڑے حکام اور وزراء اس طرح ملتے تھے کہ معلوم ہوتا عجز و فروتنی کی کوئی تصویر ہے۔ جو اس کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہے۔ وہ اب مہاراجہ کی منظورِ نظر تھی

دُنیا کی ریت رسم بھی عجیب ہے، غربت اور فلاکت انسان کا وقار

چھین لیتی ہے، اور اس میں کچھ نہ کچھ چھچھورا پن آ ہی جاتا ہے اور اگر غریب اگر دولتمند ہو جائے، تو بغیر کسی سابقہ تربیت اور تجربہ کے خود بخود اس میں وقار پیدا ہو جاتا ہے، ہیرا جب تک محل کی ایک خادمہ تھی، خاک راہ تھی، جب وہ مہاراجہ کی ناک کا بال بنی، وقار اور حشمت کا پیکر بن گئی، جو نوکر اسے گالی پہلے دیتے تھے بات بعد میں کرتے تھے وہی نوکر اب اس کے سامنے جاتے ہوئے بید لرزاں نظر آتے تھے۔

مہاراجہ کے منہ چڑھے مصاحب، ان کے وزیر باتدبیر، اُن کے حکام والا مقام، سب ہیرا سے دبتے تھے، وہ کسی کی سفارش کر دے، تو اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب نذر ہیں، وہ کسی سے خفا ہو جائے تو جیل کا دروازہ اور برخاستگی کا پروانہ اس کا رفیق زندگی ہے۔ اس انقلاب احوال سے ہر شخص متحیر تھا، لیکن ہیرا! وہ ایک باکمال ایکٹرس کی طرح بڑی خوبی سے اپنا پارٹ ادا کر رہی تھی، وہی شاہانہ رکھ رکھاؤ، وہی رعب داب وہی جلال و جمال صنعت تضاد، کہیں سے بھی تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک آوارہ گرد چھوکری تھی جس زاویہ سے دیکھیے"... صورت سے قطع نظر کر کے... یہی معلوم ہوتا تھا، وقار شاہی اس کا پیدائشی حق ہے۔

مہاراجہ کے التفات خصوصی کا یہ حال تھا کہ وہ محل میں ہوں یا دورہ پر سفر میں ہوں یا حضر میں، سیر و شکار کے لئے نکلے ہوں یا معائنہ اور تفتیش

کے لئے، کہیں مہمان بن کے گئے ہوں، یا کسی کے میزبان ہوں، ہیرا سایہ کی طرح اُن کے ساتھ تھی، راجے مہاراجے اس سے ہاتھ ملاتے تھے۔ اسکی دعوتیں قبول کرتے تھے اسے مدعو کرتے تھے،

وہ مہارانی نہیں تھی لیکن مہارانیاں اس سے جلتی تھیں، راجکماری اس کا ادب کرتی تھیں، وہ کچھ نہیں تھی، لیکن سب کچھ تھی، کیا نہ تھی؛ شہر سے باہر مہاراجہ کا ایک بہت بڑا باغ تھا، اسمیں ایک دل کشا محل تعمیر ہوا، باغ ہیرا باغ بن گیا، ہیرا وہاں جاکر آباد ہوگئی، اور اس کے وہاں پہنچتے ہی گویا ایک نیا شہر بس گیا،

وقت کا کافی حصہ، اسی باغ میں مہاراجہ صرف کرتے تھے، وزیر حضوری یہیں حاضر ہوتے تھے، کاغذات پیش کرتے تھے، دستخط کراتے تھے، ہیرا کی تلخ تنقیدیں سنتے تھے، اور شاداں وفرحاں تشریف لے جاتے تھے۔ نا ممکن تھا ہیرا باغ میں کوئی وزیر، یا کوئی حاکم عقیدت اور وفاداری کے پھول چڑھائے بغیر واپس چلا جائے، ہیرا اپنے عالی شان ملازمین سے اسی طرح پیش آتی تھی جس طرح ایک مہارانی کو پیش آنا چاہیئے۔

دن گذرتے گئے، ہیرا کا بازار اپنا رنگ جماتا رہا، اس ہیرے کے سامنے نہ کسی دُرِ آبدار کی چلتی تھی، نہ لعل بے بہا کی، بظاہر یہ کم مایہ تھا لیکن اس کا مول مہاراجہ کا دل تھا، وہ دل جس کی قیمت ہفت اقلیم کا خزانہ بھی نہیں

ادا کرسکتا،

ہیرا کی ترقیوں کے ساتھ اس کا خاندان بھی، عروج کی برکت سے آشنا ہوگیا، اس کا بھائی، بالکل ناخواندہ تھا، لیکن توشہ خانۂ شاہی کا مہتمم بنادیا گیا، اس کے باپ کو بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا، لیکن دفعتہً وہ گسٹ ہاؤس کا سپرنٹنڈنٹ مقرر کردیا گیا، اس کا بہنوئی، ۲۰ روپیہ مہینہ کا کلرک تھا، لیکن دیکھتے دیکھتے شاہی ڈیوڑھی کا داروغہ بنادیا گیا،

دن ہفتے بنے، ہفتوں نے مہینوں کی صورت اختیار کی، مہینے سال بن گئے، ہیرا کا آفتاب اقبال ابتک نصف النہار پر تھا،

مہاراجہ کا ذاتی دفتر ہیرا باغ میں تھا، اس دفتر کے انچارج پنڈت روپ نرائن تھے، یہ ابھی ولایت سے واپس تشریف لائے تھے، بیرسٹر تھے، اور ان تمام کمالات کے حامل تھے، جو دیار فرنگ کے ایک سیاح کے لئے مایۂ ناز ہوسکتے ہیں، انھوں نے اپنی عمر عزیز کے دس سال سیر فرنگ میں صرف کئے تھے، اب تک ناکتخدا تھے، حالانکہ نام خدا زندگی کی ۴۰ بہاریں دیکھ چکے تھے صورت شکل کے اچھے تھے، صحت مند بھی تھے، کھلتا ہوا رنگ، ستواں ناک سڈول جسم، کتابی چہرہ، ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی دستبرد زمانہ کی شکار نہیں ہوئی تھی، سب میں تازگی اور رعنائی باقی تھی، تھے وہ ۴۰ سال کے لیکن دیکھنے والا ان کی عمر کا اندازہ ۲۵ - ۳۰ سال سے زیادہ کا نہیں کرسکتا تھا

ایک ہزار ماہوار انہیں تنخواہ ملتی تھی،

سرکاری حکام میں سب سے زیادہ نئے محل کے اندر آمد و رفت انہی کی تھی، ہیرا بھی اکثر ٹہلتی ہوئی ان کے دفتر کی طرف آنکلتی تھی، اسے دیکھتے ہی یہ اس طرح نہال ہو جاتے تھے، جیسے خزاں رسیدہ باغ میں بہار آگئی ہو، سراپا اخلاق و تواضع، عجز و فروتنی، خاکساری و نیازمندی بن جاتے تھے، پنڈت جی کا حال یہ تھا کہ ہیرا نے کوئی بات کہی، اور انہوں نے مسکرانے کے لئے اپنے موتی کے سے سفید اور بے داغ دانتوں پر سے ہونٹوں کا نقاب اٹھایا اسکی بات پوری ہوئی اور انہوں نے اپنے چہرہ پر ایک خاص عقیدت مندانہ کیفیت پیدا کر کے غیر مشروط تائید کا اعلان کیا، کبھی ایسا ہوتا وہ آئی، اور نسیم صبح کی طرح پنڈت جی کو لوریاں دیتی ہوئی چلی گئی، اور کبھی ایسا بھی ہوتا، وہ آئی اور شب ہجر کی طرح جم کر بیٹھ گئی، پہلی صورت میں پنڈت جی پر غنودگی کی صورت میں ایک نشہ سا چھا جاتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا مجنوں کی روح ان کے جسم خاکی میں حلول کر گئی ہے، ہیرا کے لئے ہر کیفیت دلچسپ تھی۔

رفتہ رفتہ، حجاب اور وقار کا سوال ختم ہوا، رومان اور الفت کی منزل شروع ہوئی، ہیرا سے زیادہ پنڈت جی بیتاب تھے، بیتاب ہیرا بھی تھی لیکن ضبط عورت کا حصہ ہے، وہ اپنے تپش لئے دیئے رہتی تھی، بیقراری مرد کی سرشت ہے، اور پنڈت جی تو بس سراسر سیماب بنے ہوئے تھے، جانتے

ہی نہیں تھے، سکون، اثبات کسے کہتے ہیں،

اب کیفیت یہ تھی کہ ہیرا آ پہنچی اور پنڈت جی نے داستان فراق، بہ رنگ طلسم ہوش ربا شروع کی، وہ ایک جج کی طرح، ان کا بیان سن رہی ہے، ایک بڑے بیرسٹر کی طرح کبھی کبھی بیچ میں ایک آدھ بات جرح یا سوال کی صورت میں کر لیتی ہے، اور یہ ایک ملزم کی طرح اپنا بیان حلفی داخل کر رہے ہیں،

پنڈت جی نے ہیرا کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ زندہ صرف اسلئے ہیں کہ اس کا درشن ہو جاتا ہے جس دن یہ آس جاتی رہے گی، اس دن وہ اس دنیائے فانی سے کوچ کر جائیں گے، انہوں نے ہیرا کو یقین دلا رکھا تھا کہ اسکی آواز سنتے ہی، اس سے نظریں ملتے ہی، اس کے قریب آتے ہی وہ ایک نشہ کی، بیخودی کی، دنیا میں پہنچ جاتے ہیں،

عورت جلد یقین کر لیتی ہے، پنڈت جی کے ارشادات اسکے نزدیک حقائق و معارف کے دفتر تھے، اس رومان کے دو اثرات بہت نمایاں تھے ایک تو یہ کہ ہیرا نے اپنے التفات خاص کا مرکز پنڈت جی کو بنا لیا تھا، وہ اب محبت کا جواب صرف محبت سے نہیں بلکہ سپردگی سے دینے لگی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ پنڈت جی کی تنخواہ اور الاؤنس میں بھی بقدر دو سو کے اضافہ ہو گیا تھا، یہ کیسے ممکن تھا وہ کسی قابل اور محنتی آدمی کی سفارش مہاراجہ سے کرے، اور مہاراجہ اسے ٹال دیں، اور آدمی بھی وہ جس کی سعادتمندی

اور خوش اطواری کا انہیں ذاتی تجربہ بھی تھا۔

اسی طرح بہت دِن گذر گئے، ہیرا اب دو کشتیوں میں سوار تھی، وہ مہاراجہ کے کاشانہ میں بھی اپنی چمک دکھا رہی تھی اور پنڈت جی کے سینہ خانۂ دل میں بھی اسکی روشنی تڑپ رہی تھی،

ایک روز ہیرا میں اور پنڈت جی میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں، یہ سرگوشیاں اب بے تکلف صورت اختیار کر چکی تھیں، ہیرا کا ہاتھ پنڈت جی کے ہاتھ میں تھا، ان کے ہونٹ اس ہاتھ کو چوم رہے تھے۔ دونوں اسوقت جذبات کی کشمکش میں گرفتار تھے، دونوں فکرِ مستقبل سے بے نیاز تھے، ہیرا اپنے تئیں پنڈت جی کی تحویل میں دے چکی تھی۔

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

اور پنڈت جی جذباتِ بہیمی کی تصویر بنے ہوئے تھے، سرگوشیاں اب لب بہ لب تھیں، پہلو بہ پہلو تھیں "منہ در منہ" تھیں

کیف و سکر کا یہ عالم طاری تھا کہ دروازہ کھلا، اور کوئی فائل ہاتھ میں لئے ہوئے مہاراجہ صاحب تشریف لائے، انہوں نے یہ منظر دیکھا، اور قبل اس کے کہ ان کی آنکھیں پورا جائزہ لے سکیں، برقِ جنبدہ کی طرح ہیرا پنڈت جی کے آغوشِ محبت سے دُور ہو گئی، پنڈت جی کے آغوشِ محبت

سے دُور ہوگئی ، پنڈت جی نے بھی ہیرا کو اس طرح بیساختگی کے ساتھ چھوڑ دیا ، جیسے کسی دہکتے ہوئے انگارہ پر ان کا ہاتھ پڑ گیا ہو ،

مہاراجہ نے یہ دونوں منظر دیکھے ، پہلا بھی اور دوسرا بھی ، ہیرا ڈر رہی تھی کہ اب وہ دیوار میں چنوا دی جائے گی ، پنڈت جی لرز رہے تھے کہ اب نقد جان کی خیر نہیں ، لیکن بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ، مہاراجہ کے پُر جلال چہرہ پر تبسم کھیلنے لگا ، دہکتا ہوا انگارہ پھول بن گیا ، اُنہوں نے کہا

"اچھا ، یہ بات ہے ،"

اور اپنی کرُسی پر بیٹھ گئے ، ہیرا اور پنڈت جی مُلزم کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے ،

مہاراجہ نے گھنٹی بجائی ، آدمی حاضر ہوا اسے حکم دیا ، پنڈت مہاراج کو بلا لاؤ ، ہیرا اور پنڈت جی سے کرُسی کی طرف اشارہ کرکے کہا ، بیٹھو ، دونوں اس طرح بیٹھ گئے ، جیسے عامل کے حکم کی معمول تعمیل کرتا ہے

پنڈت جی مہاراج آئے ، یہ شاہی پنڈت تھے ، خاندان شاہی کے شادی بیاہ کی رسوم انہی کے مبارک ہاتھوں انجام پاتی تھیں ، مہاراجہ نے اُن سے کہا ، آپ کو تکلیف اسلئے دی گئی ہے کہ ہیرا اور پنڈت روپ نرائن میاں بیوی کی طرح رہنا چاہتے ہیں ، آپ ان کی رسم شادی ، ابھی یہیں انجام دے دیجئے ۔

پنڈت جی مہاراج چونکتے ہوئے ، مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ،

انہوں نے مزید تصدیق چاہی، لیکن مہاراجہ کے چہرہ پر سنجیدگی طاری تھی وہ خاموشی سے اپنا فرض انجام دینے پر تیار ہو گئے، محل کے کچھ اور آدمی بھی بلا لئے گئے، پنڈت جی نے اشلوک پڑھے، اور ہیرا اور رُوپ نرائن میاں بیوی بن گئے، دونوں کو اس کی خوشی تو تھی کہ جان بچ گئی لیکن رُوپ نرائن یہ سوچ رہے تھے کہ ہم سوہنی کو کیا جواب دیں گے جن سے دعویٰ عشق کر کے شادی کا وعدہ لے چکے تھے، اور ہیرا یہ سوچ رہی تھی کہ محل سے نکل کر وہ اب پھر جھونپڑے میں جا رہی ہے، دیکھئے زندگی کیسے بسر ہو، دونوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے، دونوں کا شعلۂ عشق افسردہ ہو رہا تھا۔

مہاراجہ اُٹھے، انہوں نے رُوپ نرائن سے کہا، ہیرا تمہاری بیوی ہے اسے اپنے ساتھ لے جاؤ، لیکن اگر تم نے دُوسری شادی کی یا ہیرا سے بُرا برتاؤ کیا تو یاد رکھو میری سزا بڑی خوفناک ہوگی۔

آگے روپ نرائن، اور پیچھے پیچھے ہیرا! — یہ مختصر سا قافلہ محل سے نکل کر پھر جھونپڑے میں پہنچ گیا،

ع — پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۱۴۱)

مہاپاپ

جو لوگ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جن کے قدموں می
سیم و زر کا انبار لگا رہتا ہے۔ جن کا کام صرف یہ ہوتا ہے اس دنیا می
کہ جب تک زندہ ہیں، پوری بے تکلفی اور بے باکی سے زندگی کے مز
لوٹیں ان کے سوانح حیات میں، پن، دیا، کرم کی تلاش کرنا بڑی بد ذو
ہے، وہ تو پاپ اور گناہ کی سرپرستی کرنے کے لئے عالم وجود می
آتے ہیں، سچ تو یہ ہے اگر یہ لوگ نہ ہوں، تو پاپ اور گناہ کی دنیا سو

ہوجائے۔ پاپ یتیم ہوجائے، اور گناہ گوشہ نشیں ہوجائے، خدا سلامت رکھے ہمارے عیش پرست دولتمندوں کو جن کے دم سے ظلم اور سفاکی، تفاوت اور درندگی، بداخلاقی اور آوارگی، ناانصافی اور جور بیحد، مہاپاپ اور گناہِ عظیم کی زندگی قائم ہے، شیطان زندہ ہے اگر کہیں بدقسمتی سے یہ لوگ نیک اور خوب سیرت ہوتے تو بیچارہ شیطان خودکشی کر چکا ہوتا اور صفات ذمیمہ دُنیا کی ابتدائی نسل کے بعض ان جانوروں کی طرح ناپید ہو چکے ہوتے جن کے ڈھانچے تو ماہرین علم الحیوانات اور محققین ارضیات کو کہیں کہیں دستیاب ہوجاتے ہیں مگر جن کا وجود ختم ہو چکا ہے۔

مہاراجہ کے محل میں نہ داسیوں کی کمی تھی، نہ دیودا سیوں کی، نہ خواصوں کی نہ کنیزوں کی نہ طوائفوں کی نہ داشتاؤں کی، رانیوں اور مہارانیوں کی تعداد بھی ماشاء اللہ ضرورت سے کہیں زیادہ تھی ضرورت سے زیادہ اسلئے کہ متعدد ایسی تھیں جو کرم خوردہ ہو چکی تھیں، زندگی کا ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جو چیز استعمال کی جاتی رہے گی، زندہ رہے گی۔ جس کا استعمال ترک کردیا جائے گا۔ بے موت مرجائے گی۔ چنانچہ یہ رانیاں اور مہارانیاں وہ تھیں جو نگاہ اور دل سے اُتر چکی تھیں۔ اُن کے لئے عالی شان محل تھا، خدم وحشم کا ساماں تھا، خرچ کے لئے روپیہ تھا، خدمت کرنے کے لئے ملازم تھے، سیر و تفریح کے لئے شاندار موٹریں اور گاڑیاں تھیں، سب کچھ تھا،

مگر مہاراجہ اُن کی قسمت کے نہیں تھے۔ مہاراجہ اُن کے قریب رہ کر بھی
اُن سے دُور تھے، ان کی رسائی سے بالا تھے۔

ہم اُڑ کر بھی نہ پہنچیں ہم سے اتنی دُور ہو جانا۔
مبارک شاخِ گل کو شاخِ نخلِ طور ہو جانا

انہی متروک رانیوں میں ایک رانی صاحبہ بھی تھیں جن کا نام آسا تھا۔
نک سک سے درست، خوبصورت، خوب سیرت، جامہ زیب،
چہرہ ایسے جیسے گلاب کا پھول، باتیں ایسی جیسے بُلبُل کا راگ، گانا ایسا جیسے
کوئل کی کوک، رنگ ایسا جیسے تپا ہوا سونا، لیکن خوبیوں کے باوجود متروک
تھیں، اور محل کے فلک رفعت قید خانہ میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں
ان کے بڑے بھائی رنجیت سنگھ مہاراجہ کے اے۔ ڈی۔ سی تھے
ایک عرصہ تک وہ مہاراجہ کی بے التفاتی اور اپنی بہن کی حرماں نصیبی دیکھتے
رہے، ضبط اور صبر کے ساتھ، لیکن کب تک؟ آخر بھائی تھے، ایک ہی خون
دونوں کی رگوں میں گردش کر رہا تھا، ایک روز اُبل پڑے مہاراجہ کے
سامنے۔

ہوا یہ کہ مہاراجہ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہوئے تھے اتفاق سے ہو تنہا
تخلیہ تھا، رنجیت سنگھ گئے اور مودب کھڑے ہو گئے۔ مہاراجہ نے
اُوپر نظر اُٹھائی، بڑی انسانیت سے فرمایا:۔

"آؤ رنجیت"

"سرکار حکم ہو تو ایک بات عرض کروں"؟

(مسکرا کر) ہاں ہاں ایک نہیں جتنی باتیں چاہو کہو"۔

"مجھ سے اب آشا کی حالت نہیں دیکھی جاتی "۔

"یعنی"؟

"یعنی یہ کہ وہ آپ کی رانی ہے، آپ اسے اپنا رفیقِ زندگی بنا کر
ائے تھے، کچھ دن تک وہ سکھ اور چین کی زندگی بسر کرتی رہی اب حالت یہ
ہے کہ آپ اسکی بات بھی نہیں پوچھتے، اسکی طرف رُخ بھی نہیں کرتے، اسکی خبر
بھی نہیں لیتے، وہ ہمیشہ کی خاموش ہے، ظلم اور زیادتی پر احتجاج کرنا جانتی ہی
نہیں، آپ کے یہ ستم سہ رہی ہے اور اندر ہی اندر گھلی جا رہی ہے۔ میں
ان آنکھوں سے اس کا یہ حال دیکھوں، بعض دفعہ تو میرا جی چاہتا ہے کہ پستول
سے ایک گولی اس کے ماروں، دوسری سے اپنا خاتمہ کر لوں، یہ بھی کوئی زندگی
ہے زندگی ہے؟"

مہاراجہ صاحب خاموشی سے رنجیت کی باتیں سنتے رہے، پھر انہوں نے
فرمایا:-

"رنجیت تم دیکھتے ہو میں کتنا عدیم الفرصت ہوں، مجھے اتنی مہلت
کہاں کہ محل میں جاؤں اور مہارانیوں سے خلا ملا کروں، یہ سب باتیں تو

اس وقت مزہ دیتی تھیں، جب کوئی فکر نہیں تھی، اب تو ہزاروں جھنجال ہیں جن میں پھنسا ہوتا ہوں۔"

رنجیت سنگھ نے قدرے غصہ سے کہا اگر واقعی یہ بات ہوتی تو نہ آشا کو دکھ ہوتا نہ مجھے رنج ہوتا۔ میں دیکھتا ہوں آپ کو محل میں ہمارے کی، مہارانیوں سے حلا ملا کرنے کی، آشا سے بات چیت کرنے کی فرصت نہیں ہے، لیکن عیاشیوں کے لئے وقت نکل آتا ہے، شاہد بازاری کے لئے آپ کے پاس وقت ہی وقت ہے۔ پرائی بہو بیٹیوں کو اغوا کرانے جبر و جود سے انہیں حاصل کرنے، ان کی آبرو برباد کرنے کا کام اتنا اہم ہے کہ آپ نہ دن دیکھیں نہ رات، یہ انصاف ہے؟ یہ انسانیت ہے؟ یہ شرافت ہے، آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؛ کیا آپ کے اس عذر کو کوئی صحیح الدماغ شخص باور کر سکتا ہے؟

مہاراجہ کے جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ اپنی ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے وہ، کسی کی کیا مجال کہ ان سے رو در رو تند و تلخ باتیں کرے ان کے قہر و غضب کا تو یہ عالم تھا کہ بڑے بڑوں کا پتہ ان کے سامنے پانی ہوتا تھا، خود رنجیت سنگھ ہمیشہ ان سے کانپتا، لرزتا رہتا تھا، لیکن بہن کی محبت نے اسے اس وقت بے قابو کر دیا، اور وہ جو جی آیا کہتا چلا گیا خلاف توقع مہاراجہ بڑے حلم و ضبط سے اسکی باتیں سنتے رہے

نہ چہرہ پر غضب کے آثار نہ ماتھے پر شکن، وہ خاموشی سے رنجیت کی باتیں سنتے رہے، پھر مسکرائے، بڑی شفقت سے انہوں نے کہا۔

"خفا ہو گئے تم؟"

"سرکار مجھ سے آشا کی حالت نہیں دیکھی جاتی"۔

"ہم مانتے ہیں ہم نے زیادتی کی"۔

رنجیت خاموش رہا، مہاراجہ نے پھر کہا۔

"ہم اپنے ظلم کی تلافی کریں گے"۔

"وہ کس طرح سرکار؟"

"تم آشا کے پاس جاؤ اس سے میری طرف سے معافی مانگو، اسوقت تو مجھے دوسرا کام ہے ٹھیک نو بجے رات کو میں خاص محل میں پہنچ جاؤں گا اسوقت تم آشا کو لے کر وہاں آؤ، ہم سب ساتھ کھانا کھائیں گے، کچھ دیر بات چیت کریں گے۔ پھر تم اپنے گھر چلے جانا، اور میں آشا کو اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جب تک وہ مجھے معاف نہ کر دے"۔

یہ کہکر مہاراجہ اٹھے، رنجیت نے ادب سے انہیں سلام کیا، اور باہر آگیا۔

رنجیت سیدھا آشا کے ہاں پہنچا وہ حسب معمول افسردہ بیٹھی تھی، لیکن اس افسردگی کے عالم میں بھی وہ دلربائی کا ایک مجسمہ معلوم ہوتی تھی رنجیت

کی باچھیں کھلی جارہی تھیں، وہ قدم رکھتا کہیں تھا، پڑتا کہیں تھا، کہنا کچھ چاہتا تھا، کہتا کچھ تھا، آشا نے اس کا یہ رنگ دیکھ کر پوچھا:-

"بھیا کیا بات ہے آج تو تمہارا عجیب حال ہے"۔

"ایسی ہی بات ہے آشا"

"کیا ہے وہ بات؟"

"بتا دوں"؟

"ہاں ہاں بتاؤ"

"مٹھائی کھلائے گی تو؟"

"جتنی کہو"

"اچھا سن"

یہ کہکر رنجیت نے آج کا سارا واقعہ من وعن اُسے سنا دیا، یہ سب کچھ سنکر آشا بجائے خوش ہونے کے اور زیادہ پریشان ہو گئی، رنجیت نے کہا۔

"یہ کیا؟"

"بھیا مجھے تو دال میں کالا معلوم ہوتا ہے"

"پاگل کہیں کی"

"سچ کہتی ہوں بھیا"

"کیا سچ کہتی ہے تو؟"

"مہاراجہ سخت غصہ میں ہیں نہ جانے اب وہ کیا کر ڈالیں"۔

"غصہ میں ہوتے تو اس وقت کرتے جو کچھ اُنہیں کرنا ہوتا جب میں نے سخت باتیں کہیں اور اُنہوں نے سُن لیں، اب تو وہ شرمندہ ہیں اور اپنے ظلم کی تلافی کرنا چاہتے ہیں"۔

"رام کرے یہی ہو"۔

تو تمہیں شبہ ہے"۔

"ہاں بھیا میرا تو دل ہول رہا ہے"۔

"آخر کیوں؟"

"یہ اُن کے ٹھنڈے غصہ کی علامت ہے"۔

"ٹھنڈا غصہ؟"

"ہاں!"

"میں نہیں سمجھا؟"

"میں جانتی ہوں، میں سمجھتی ہوں"۔

"آخر وہ ہے کیا بتاؤ تو؟"

"جب انہیں انتہا کا غصہ ہوتا ہے تو وہ ایسے ہی ٹھنڈا ہے، وہ میٹھے بن جاتے ہیں، اور پھر وہ بدلہ لیتے ہیں کہ خیال کے رونگٹے کھڑے

ہوتے ہیں۔"

"آشا یہ تمہارا وہم ہے"

"شاید ایسا ہی ہو"

"ایسا ہی ہے، میں نے ان سے بات کی ہے، میں نے ان کا چہرہ بشرہ دیکھا ہے، میں اتنے دنوں سے اُن کے ساتھ ہوں، اُن کے مزاج کو پہچانتا ہوں، میں نے بھی دنیا دیکھی ہے، آدمیوں سے ملا ہوں، گفتگو کے رنگ ڈھنگ سے، آدمی کے عادات و اطوار سے میں بھی واقف ہوں، میں تمہیں یقین دلاتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔"

"اچھا یہی سہی"

"تو اب تم تیاری کرو"

"کاہے کی تیاری؟"

"خاص محل نہیں چلو گی؟"

"مہاراجہ بلائیں، تم دعوت لاؤ، اور میں نہ جاؤں، ضرور چلونگی" یہ کہہ

وہ ہنسی۔

"تو اب دیر کیا ہے؟"

"ابھی تو سات بجے ہیں"

"ایک گھنٹہ تو تمہیں تیار ہونے میں لگ جائے گا۔"

"میں تیار ہوں"

"یوں ہی چلوگی؟"

"ہاں کیوں نہیں"

"نہیں یہ اچھا نہیں لگتا"

"بھیا اس معاملہ میں تم نہ بولو"

"اچھا یہی سہی"

GLO... 150/3, Bihar Colony, KARACHI

بہن بھائی ساڑھے آٹھ بجے تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ایک کار میں بیٹھے اور خاص محل کی طرف روانہ ہوگئے، یہ مہاراجہ کا بالکل خاص محل تھا۔ یہاں بغیر ان کی اجازت کے پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

ٹھیک نو بجے رنجیت اور آشا مہاراجہ کے محل میں پہنچ گئے مہاراجہ بڑے التفات کے ساتھ پیشوائی کے لئے بڑھے، رنجیت اور آشا سے ہاتھ ملایا، ساتھ ساتھ سب ایک بڑے کمرہ میں داخل ہوگئے، ایک صوفے پر مہاراجہ اور آشا، دوسرے صوفے پر رنجیت سگار سلگاتے ہوئے مہاراجہ نے آشا سے کہا۔

"تم بہت خفا ہو مجھ سے؟"

"نہیں تو"

"نہیں ضرور ہو، اور تمہیں ہونا بھی چاہیئے خفا مجھ سے"

"کیوں خفا ہونا چاہیئے؟"

"میں تم سے بات بھی نہیں کرتا، اپنی رنگ رلیوں میں مست رہتا ہوں جسطرح میرے سینہ میں دل ہے، اور اسمیں آرزوئیں ہیں اسی طرح تمہارے سینہ میں بھی دل ہے، اور اسمیں ضرور آرزوئیں مچلتی ہونگی، پھر یہ میری بیہودگی نہیں ہے کہ میں اپنے ارمانوں کو تو پروان چڑھاؤں، اور تمہارے ارمانوں کو بے التفاتی کے قدموں سے کچل ڈالوں؟"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں مہاراج؟ میرے دلمیں تو یہ باتیں کبھی نہیں آئیں"۔

"کیوں کیا تم آدمی نہیں ہو؟"

"آدمی کیوں نہیں ہوں لیکن عورت ہوں اور عورت بھی ہندوستان کی جہاں کی عورت شوہر پرستی کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں"

"یہ پرانے زمانہ کی باتیں ہیں"

"لیکن ان کے سچے ہونے میں تو شبہ نہیں؟"

"(مسکرا کر) رنجیت سے پوچھو"

"مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں، میں اپنا فرض جانتی ہوں اسپر چپ چپاتے عمل کرتے رہنا میرا کام ہے۔"

"تمہارے دلمیں میری بے التفاتیوں کا ذرا بھی شکوہ نہیں؟"

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"بالکل نہیں"

"جھوٹ نہ بولو آشا" رنجیت نے کہا۔

"میں کبھی جھوٹ نہیں بولتی"

"تمہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ مہاراجہ رنگ رلیاں کریں، دُنیا کے مزے لُوٹیں، اور تمہاری خبر بھی نہ لیں"۔

"بالکل اچھا نہیں لگتا"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میں اُن سے کوئی شکایت نہیں کرتی، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی کے بعض کام ہمیں اچھے نہ لگیں، لیکن ہمیں اس سے کوئی شکایت بھی نہ ہو"

"یہ باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آتیں"

"یہ باتیں عورت کے سوا کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتیں"

"خدا کا شکر ہے کہ میں عورت نہیں ہوا"

اسپر مہاراجہ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا، رنجیت بھی مسکرا دیا، اور آشا نے بھی مسکرا کر گردن جھکالی۔

مہاراجہ نے کہا، اب کھانے کا وقت آگیا ہے، چلو کھانا کھائیں۔

سب لوگ ڈائننگ رُوم میں آگئے، دسترخوان چُنا گیا اور کھانے کا دور شروع ہو گیا۔

RAJA LIBRARY

کھانے کے دوران میں بھی اِدھر اُدھر کی دلچسپ اور پُر لطف باتیں ہوتی رہیں، کھانے کے بعد مہاراجہ کے اشارہ سے جام و ساغر کا اہتمام ہوا، مہاراجہ اس آتشِ سیال کے پُرانے رسیا تھے، رنجیت کو بھی اس سے پرہیز نہ تھا، آشا نے البتہ کبھی اس چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

خود مہاراجہ ساقی بنے، جام بھر بھر کے رنجیت کو پلانے اور خود پینے لگے، ایک جام انہوں نے آشا کی طرف بڑھا دیا، اس نے ادب سے کہا،

"میں تو نہیں پیتی مہاراجہ"

"اور اگر میری خوشی اسی میں ہو تو؟"

مجھے اس سے بڑی نفرت ہے سرکار"

"یہ تو میں جانتا ہوں لیکن مجھے دیکھنا ہے کہ تم میری خوشی کا کہاں تک خیال رکھتی ہو، لو، پیو،"

"مہاراجہ مجھے معاف کیجیے"۔

"یہ میری تمنا ہے، اور میں تم سے اُمید رکھتا ہوں کہ تم میری تمنا نہیں ٹھکراؤگی"

آشا نے گلاس لے لیا بڑی کراہت اور جھجک کے ساتھ وہ اسے پی گئی، مہاراجہ کو اب بھی تشفی نہیں ہوئی، وہ خم پہ خم چڑھا رہے تھے اور جام پہ جام رنجیت اور آشا کو دے رہے تھے۔

رنجیت تو شروع ہی سے بے تکلفی کے ساتھ پی رہا تھا، آشا نے شروع شروع میں تکلف کیا، لیکن دو ایک جام چڑھانے کے بعد وہ بھی رنگ پر آگئی، ادھر مہاراجہ نے جام بڑھایا، ادھر اس نے بے تابی کے ساتھ لیا، اور غٹ غٹ چڑھا گئی، مہاراجہ خود بھی پی رہے تھے، لیکن ذرا احتیاط کے ساتھ، رنجیت تو اس وقت بلانوش بنا ہوا تھا، آشا پہلی مرتبہ اس نشہ کی لذت سے آشنا ہوئی تھی، وہ بھی اسوقت بے خود ہو رہی تھی، پہلے تو مہاراجہ کے اصرار پر بھی پینا نہیں چاہتی تھی، اور اب تقاضے کر کر کے مہاراجہ سے جام بلوریں کا مطالبہ کر رہی تھی،

بڑی دیر تک یہ بزم جمی رہی، یہاں تک کہ رنجیت اور آشا نشہ میں مبہوت ہو گئے، انہیں سر پاؤں کا ہوش نہ رہا، اس حالت میں بھی مہاراجہ کی طرف سے ان دونوں کی تواضع کا سلسلہ جاری تھا، مہاراجہ اٹھے، انہوں نے کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا، بغل میں ایک اور کمرہ تھا، وہاں رنجیت اور آشا کو لے گئے، یہ کمرہ بھی ہر طرح سے آراستہ تھا، یہاں آنے کے بعد پھر دور چلا، اب حالت یہ تھی کہ رنجیت بہکی بہکی باتیں کرنے لگا، آشا کی آنکھوں میں لال ڈورے پڑ گئے تھے، اور وہ بھی اناپ شناپ باتیں کر رہی تھی۔

"آشا نے، بڑے چاؤ سے کہا،

مہاراج"

مہاراج نے دانتوں کے نیچے انگلی داب لی، رنجیت کی طرف اشارہ کر کے کہا "مہاراج یہ ہیں، میں تو رنجیت ہوں آشا"

رنجیت نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا، ہاں ہاں میں ہوں مہاراج، بول کیا بولتی ہے، مانگ کیا مانگتی ہے؟"

"آپ کی روٹھی ہوئی محبت، آپ کا چھینا ہوا پریم، آپ کی کرپا!" آشا نے مخمور نگاہوں سے رنجیت کی طرف دیکھکر کہا۔

مہاراجہ مسکرائے، انہوں نے رنجیت سے کہا۔

"سرکار آپ نے وعدہ کیا تھا، اب سے آپ آشا پر ظلم نہیں کریں گے اپنے کئے ہوئے ظلموں کی تلافی کریں گے، اس سے چاہ اور پریم کا رشتہ پھر جوڑیں گے۔"

رنجیت نے آشا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا، اسے اپنے آغوش میں لیا، اور کہا، ہاں مجھے یاد ہے، میں نے کیا کہا تھا، میں اپنے کہے کو پورا کروں گا۔ بیشک میں نے اس پر ظلم کیا لیکن اب میں اس کی تلافی بھی کرونگا ضرور کروں گا۔ اس کو اپنے دِل کی رانی، اور اپنی راجدھانی کی مہارانی بنا کر رکھوں گا، راج سنگھاسن پر میں بیٹھوں گا، لیکن حکومت کرے گی آشا جیسے نورجہاں اور جہانگیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"اتنا کہہ کر رنجیت وفورِ جذبات سے بے قابو ہو گیا، اُس نے آشا کو زینتِ آغوش بنا لیا، آشا بہت دنوں کی بھوکی تھی، ایک عرصہ سے محرومِ التفات تھی، اُس نے اپنے "مہاراجہ" کو مائل بہ کرم جو پایا تو ہمہ تن سپردگی بن گئی اُس نے کوئی مزاحمت نہیں کی، وہ رنجیت کے آغوش میں اس طرح پہنچ گئی جیسے کوئی گنہگار خلافِ توقع جنت میں پہنچ جائے۔

مہاراجہ کے چہرہ پر اسوقت مسرت ناچ رہی تھی، اُنہوں نے دست بستہ رنجیت سے کہا۔

"مہاراج اَب میں جاتا ہوں، اتنے دنوں کے بعد دو چاہنے والے ملے ہیں، میں ان کے راستہ کا پتھر کیوں بنوں، آپ دونوں اپنے دل کی حسرتیں نکالیں، بندہ چلا"۔

یہ کہہ کر مدہوش رنجیت اور مخمور آشا کو اس کمرہ میں چھوڑ کر، مہاراجہ باہر آئے، باہر سے اُنہوں نے کمرہ کا دروازہ بند کر لیا، اطمینان سے اپنا سگار سلگایا، اور خراماں خراماں اپنے "بڈروم" میں چلے گئے۔

صبح آٹھ بجے مہاراجہ سو کر اُٹھے، سب سے پہلے . . . . حوائجِ ضروری سے فراغت اور منہ ہاتھ دھونے سے بھی پہلے . . . . . . اپنے دو مخصوص مصاحبوں کے ساتھ اس کمرہ کی طرف پہنچے، جہاں وہ آشا اور رنجیت کو چھوڑ آئے تھے، اُنہوں نے اپنے مصاحبوں سے فرمایا

"دیکھو کتنا دلچسپ تماشا نظر آتا ہے ابھی!"

یہ کہکر مہاراجہ لے، کمرہ کی زنجیر کھولی، بڑے ولولہ سے آگے بڑھے تھے، لیکن بڑی دہشت سے پیچھے ہٹے، آشا کی گردن کٹی ہوئی تھی، رنجیت کے سینہ میں چاقو کا پورا پھل اترا ہوا تھا، اور ہاتھ چاقو کے قبضہ پر جما ہوا تھا، سارا کمرہ خونا خون ہو رہا تھا،

مہاراجہ نے جلد اپنے تئیں سنبھال لیا۔ دونوں مصاحب احساس باختہ ہو رہے تھے، اتنے میں مہاراجہ کی نظر، ایک کاغذ کے پرزہ پر پڑی یہ رنجیت کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

"مہاراجہ صاحب!

مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ اتنے ہیچ ہیں، میں آپ کو آدمی سمجھتا تھا، لیکن آپ کو ننگِ انسانیت کہنا بھی آپ کی عزت افزائی ہے،

میں مانتا ہوں آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے، مجھے اور آشا کو نشہ میں مبہوت اور مدہوش کر کے ہم دونوں سے آپ نے وہ گناہ کرایا، جو شاید اس آسمان کے نیچے کبھی نہ ہوا ہوگا، ایک بھائی، اپنی سگی بہن سے آلودہ ہوا، زمین کیوں نہیں پھٹ جاتی؟ آسمان کیوں نہیں ٹوٹ پڑتا۔

ہم دونوں بھائی بہن نشہ سے بے خود ہو رہے تھے، آشا کو شراب سے کیا واسطہ، لیکن آپ نے اُسے بھی پلائی اور خوب پلائی تاکہ آپ ہم دونوں کو مہاپاپ میں مبتلا کر سکیں، اور پھر مسکراتے ہوئے چہرہ سے کہہ سکیں تو مجھ سے کہتا تھا کہ میں دوسروں کی بہوؤں، بیٹیوں اور بیویوں سے جبراً زنا کرتا ہوں، اپنا دامن دیکھ اور بہن کا کملایا ہوا چہرہ دیکھ، کیا وہ شخص، جو اپنی سگی بہن سے زنا کر سکتا ہو، یہ حق رکھتا ہے کہ مجھے ٹوکے

بہرحال جو آپ نے چاہا وہ ہوا ہم دونوں نے وہ کیا جو ہرگز ہمیں نہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن پھر بھی ہم میں اور آپ میں وہی فرق ہے، جو انسان اور حیوان میں ہونا چاہیے۔

آپ اپنی تمام آلودگیوں، اور بدمعاشیوں کے باوجود زندہ ہیں، اور زندہ رہیں گے، ہم نے اپنے پہلے پاپ کے بعد طے کر لیا کہ اگرچہ ہمارا یہ پاپ اختیاری نہیں تھا، بہ ثبات ہوش و حواس نہیں تھا، لیکن تھا مہاپاپ، لہٰذا زندہ رہنے اور دنیا کو منہ دکھانے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے، ہم نے فیصلہ کر لیا اور ہمیں مسرت ہے کہ اسپر عمل کرنے کی ہمت بھی ہم میں پیدا ہو گئی،

پہلے میں نے اپنے تیز چاقو سے آشا کی مرضی سے اس کا خاتمہ کیا، اب میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں، اس کے بعد، وہی میرا تیز چاقو میرے سینہ کے پار ہو گا، اور آپ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے کہ آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے یعنی ہمارا مذاق نہیں اُڑا سکیں گے، ہمیں ذلیل اور بدنام نہیں کر سکیں گے، ہمیں اپنے جور بیجا کا نشانہ نہیں بنا سکیں گے اچھا اب رُخصت، اب ہمارا آپ کا معاملہ وہاں فیصل ہو گا، جہاں راجہ اور پرجا ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے

رنجیت

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب
(۱۵)
ملکہ قلوپطرہ

کسی نزہت افزا باغ میں تشریف لے جائیے، آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشنے والے پھول نظر آئیں گے، کسی چمن کی گلگشت کیجیے، طرح طرح کے گل رعنا اور گل نودمیدہ آپ کو دکھائی دیں گے، کسی گوشہ میں پھولوں کا جھرمٹ ہے، کسی کنارہ پر پھولوں کے صف بستہ پرے کے پرے مؤدب کھڑے ہوتے نظر آئیں گے، کہیں پھول کھل رہا ہوگا، اور کلی پھوٹ رہی ہوگی، کہیں پھول

مُرجھا رہا ہوگا، اور کلی سُوکھ رہی ہوگی،

مہاراجہ صاحب کا باغ عدن بھی، طرح طرح کے دِل آویز اور دلرُبا حیات بخش، اور دلکش پھولوں اور کلیوں کا مرکز تھا، یہاں وہ پھول بھی تھے جو بادِ سموم کی تاب نہ لا کر اب مرجھانے لگے تھے، اور وہ بھی تھے جو نسیمِ بہار کی لوریوں میں پروان چڑھ رہے تھے، وہ کلیاں بھی تھیں جو ابھی پتیوں کے گھونگٹ سے نکل رہی تھیں، اور وہ شگوفے بھی تھے جو بن کھلے مُرجھائے جا رہے تھے باغِ دُنیا میں بھی کچھ ہوتا رہتا ہے، دُنیا نام ہے اسی نیرنگی اور تبدیلی کا، لیکن مہاراجہ کے گلشنِ راحت میں یہ انقلاب اکثر آتا رہتا تھا، یہ تبدیلی تیزی سے ہوتی رہتی تھی،

گلبدن.... مشہور مغنیہ اور رقاصہ موتی کی لڑکی تھی، موتی کے گانے اور ناچ کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا، مہاراجہ کے والدِ بزرگوار نے ازراہِ قدردانی اُسے درباری مغنیہ اور رقاصہ بنالیا، دو ہزار روپیہ مہینہ اُسے تنخواہ ملتی تھی، سرکار کی طرف سے بنگلہ، موٹر، اور انواع و اقسام کے خوانِ نعمت اُس کے لئے موجود تھے، بڑے کھلے ڈُھلے کی عورت تھی، ایک زمانہ تو اس کا وہ تھا کہ زمین پر پاؤں نہیں رکھتی تھی، حُسن کے بارے میں بھی قدرت نے بخل سے کام نہیں لیا تھا، اور آرٹ تو اُس کی رگ رگ میں بھرا ہوا تھا، اس کا نغمہ ناہید فلک کو شرماتا تھا، یہی حال اسکے رقصِ بے محابا کا تھا، لیکن.....

ع یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا!

اب موتی کا شباب

> ازنقش ونگار در و دیوار شکستہ
> آثار پدید است صنادید عجم را

کا نمونہ بنکر رہ گیا تھا، اگر اس کا ذریعہ معاش صرف اس کا حُسن ہوتا تو اس کا بازار سرد ہو چکا ہوتا، لیکن وہ کامل فن مغنیہ بھی تھی، اور یہ کمال عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے، موتی اب ادھیڑ ہو چکی تھی، بڑھاپے کی سرحد پر قدم دھر چکی تھی، لیکن اس کا آرٹ شباب پر تھا، یہ وہ کمال تھا جو زندگی بھر زوال سے آشنا نہیں ہوتا۔

گلبدن، موتی کی چہیتی اور اکلوتی لڑکی تھی۔

> برس پندرہ یا کہ چودہ کا سن
> جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

موتی کی جان، اور خاندان کا ارمان!

عمر تو گلبدن کی ایسی کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن غضب کی لڑکی تھی وہ شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اسمیں ذہانت کا یہ حال کہ ایک دفعہ جو سن لیا، وہ زندگی بھر یاد، استاد جی گھر پر اسے رقص و نغمہ کی تعلیم دیتے تھے، ابھی اُسے سیکھتے ہوئے کچھ زیادہ مُدّت نہیں گذری تھی، لیکن اس

مختصر سی مدت میں بھی اُس نے اپنی ذہانت اور ذکاوت سے پہلے تو اُستاد جی کو گرویدہ کیا، اور پھر مرعوب کر دیا، وہ اس کے بے ڈھنگے لیکن فنکارانہ سوالات سے گھبرا سے جاتے تھے، حسن بھی اُسنے اپنی ماں سے میراث میں پایا تھا، موتی نقش اول تھی، تو گلبدن نقش ثانی اور مشہور ہے -

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

کوئی شبہ نہیں یہ نقش ثانی نقش اول سے بہ مراتب بڑھا ہوا تھا، موتی کی کوٹھی، مہاراجہ کے پائیں باغ سے بالکل متصل تھی، اتنی متصل کہ ہر وقت باسانی آمدورفت ممکن تھی، اس آسانی سے موتی کو تو زیادہ فائدہ اُٹھانے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی، لیکن گلبدن اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھی -

جب اُستاد جی کی تربیت سے فراغت ہوتی، یا ماں کی آنکھ بچی، گلبدن پائیں باغ میں موجود، کبھی اس روش پر ٹہل رہی ہے، کبھی اس کنج میں اکیلی بیٹھی ہوئی گنگنا رہی ہے، کبھی گلاب کے پودوں کا معائنہ کر رہی ہے کبھی خوبصورت، لیکن "بے رنگ و بو" پھولوں کا مشاہدہ ہو رہا ہے، مالی سامنے آ گیا، تو اُسپر فقرہ چست کر دیا، اکی لڑکی دکھائی دی تو اُسے ایک چپت لگا دی، مالن ہار گوندھتی ہوئی نظر آئی، ایک جھپٹا مارا، ہار چھین لیا، اور اس کی کرائی محنت اکارت کر دی، اُسنے قہقہہ لگایا اور مثال موج صرصر

رواں، دواں،

ایک روز وہ گلگشت چمن میں مصروف تھی، کنول کا ایک ہار خود ہی اُس نے گوندھ کر ابھی ابھی پہنا تھا اور تالاب کے آئینہ میں منڈیر پر بیٹھی ہوئی اندازہ لگا رہی تھی کہ کیسا لگتا ہے۔

نہ معلوم کس طرح مہاراجہ کا ادھر گذر ہوا، انہوں نے گلبدن کو دیکھا، ٹھٹکے، آگے بڑھ جانے کے ارادہ سے قدم اُٹھایا، پھر کچھ سوچا، مسکرائے اور گلبدن کی طرف لوٹ آئے، گلبدن اسوقت حسن و جمال کا ایک مجسمہ نظر آرہی تھی، ٹانگیں گھٹنوں تک کھلی ہوئی، بانہیں کہنیوں سے بھی اوپر تک، بے نقاب چہرہ غازہ اور پوڈر سے بے نیاز، لیکن صباحت اور ملاحت کا شاہکار، آنکھ سرمہ سے محروم، لیکن حملہ کرنے کے لئے کیل کانٹے سے لیس، وہ تالاب کے آئینہ میں اپنا رُخ روشن دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، خود ہی اپنے حسن کو پرکھ رہی تھی، دست قدرت کی صنعت گری کی خود ہی داد دے رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ گنگناتی بھی جا رہی تھی، ہاتھ جگت پر ٹکے ہوئے تھے، نگاہ تالاب پر جمی ہوئی تھی، ساق سیمیں ایک انداز خاص سے حرکت میں تھی، اور ایڑی کی ٹھوکریں، تالاب کی پختہ دیوار پر لگائی جا رہی تھیں۔

مہاراجہ کی آہٹ پا کر گلبدن مڑی، وہ سمجھتی تھی مالی ہے، کچھ کہنے ہی والی تھی کہ مہاراجہ نظر آئے، شرارت دہشت میں تبدیل ہوگئی،

شوخی پر ہیبت کا پردہ پڑ گیا، مہاراج نے کہا۔

"ارے ڈر گئیں"؟

"ہاں سرکار!"

"کیوں کیا سمجھتی تھیں تم"؟

"نہیں سمجھی ہالی ہے، دیکھا تو آپ"۔

"تو مجھ سے تم ڈرتی ہو؟"

"بہت"

"کیوں؟ کس لئے؟"

"اماں ڈراتی رہتی ہیں"۔

"کیا کہتی ہیں وہ؟"

"کہتی ہیں مہاراج خفا ہو جائیں گے، تو جان سے مار ڈالیں گے باغ میں زیادہ نہ جانا، میں اُن کی سنتی نہیں چلی آتی ہوں"

"کوئی حرج نہیں اچھا کرتی ہو تم، جب میں تمہارا ہوں تو یہ باغ بھی تمہارا ہے یہ محل بھی تمہارا ہے، یہ ریاست بھی تمہاری ہے، میرا خزانہ میرے سپاہی میری فوج، ہر چیز تمہاری ہے"۔

اس انتساب سے دل میں تو گلبدن خوش ہو رہی تھی، لیکن غیر محسوس طور پر اس کے چہرہ پر شرم کی سرخی بھی نمودار ہو رہی تھی۔

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

مہاراجہ چلے گئے، گلبدن اپنے گھر واپس آ گئی، لیکن اس وقت نہ اُسے مالی یاد تھا، نہ کنول کا ہار، اس وقت تو اُسے مہاراجہ کی میٹھی میٹھی باتیں یاد آ رہی تھیں، کتنا پیارا خواب دکھا گئے تھے وہ، یہ محل، یہ خزانہ، یہ باغ، یہ سپاہی یہ فوج، اور خود مہاراجہ سب میرے، پھر مجھے اور چاہیئے کیا؟ وہ دل ہی دل میں مہاراجہ کے الفاظ دہرا رہی تھی، خوش ہو رہی تھی، ایسی خوشی جو غیر اختیاری تھی، لیکن گلبدن جسے قابو میں رکھنا چاہتی تھی، اُسے وہ کسی وہم اور کسی خیال پر قربان کرنا نہیں چاہتی تھی، یہ اگر خواب تھا تو وہ اسی خواب میں ساری زندگی بسر کر دینا چاہتی تھی۔

اتنے میں معلوم ہوا، موتی کو مہاراجہ نے ابھی اور فوراً طلب کیا ہے موتی کپڑے بدل رہی تھی، دربار میں جانے کی تیاریاں کر رہی تھی، لیکن گلبدن کا دل بلیوں اچھل رہا تھا، زور زور سے دھڑک رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا سینہ توڑ کر باہر نکل جائے گا، کیوں کس لئے؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ دل کی یہ حالت کس لئے ہے، یہ بار بار وہ سوچتی تھی، لیکن جواب میں مہاراجہ کی ہنستی اور مسکراتی ہوئی شبیہہ آ کر کھڑی ہو جاتی تھی، اور اس کے منہ سے وہی الفاظ نکلنے لگتے۔ "جب میں تمہارا ہوں تو یہ باغ بھی تمہارا ہے، یہ محل بھی تمہارا ہے، یہ ریاست بھی تمہاری ہے، میرا خزانہ، میرے سپاہی، میری فوج، ہر چیز تمہاری ہے!" مہاراجہ کا اور ان الفاظ کا تصور کرتے ہی اس

باچھیں کھلنے لگتی تھیں، اس کے ہونٹوں پر تبسم کھیلنے لگتا تھا،

موتی مہاراجہ کے دربار میں کب کی جاچکی تھی، لیکن گلبدن کو نہ اس کے جانے کی فکر تھی، نہ آنے کی پروا، وہ اپنی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، ایک ہلکا سا چادرا اوڑھے ہوئے تھی، بظاہر سو رہی تھی، لیکن دراصل آنکھیں بند کرکے عالم خیال کی سیر کر رہی تھی وہ،

بڑی دیر گذر گئی، نہ جانے اس نے کیا سوچا، اٹھی اور آئینہ خانہ میں چلی گئی، آئینہ کے سامنے کھڑی ہوکر اپنا معائنہ کرنے لگی، گویا اسوقت اپنا کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہے،

اتنے میں موتی آگئی، اس کے چہرہ پر مسرت کا نور چمک رہا تھا، آتے ہی اس نے "میری بیٹی" کہکر گلبدن کو زور سے بھینچا اور گلے لگالیا،

اس التفاتِ خصوصی پر گلبدن ذرا چکرائی، اس نے ماں کی گود میں جگہ بناکر پوچھا۔

"کیا بات ہے اماں؛"

"(مسکراکر) بڑی اچھی بات"۔

"تو بتاؤ نا"

"سنوگی تو پھولی نہ سماؤگی"۔

"تو سناؤ بھی"

"میری بیٹی تو راج کرے گی"

"(دل میں کچھ کچھ سمجھ کر لیکن بظاہر حیرت کے ساتھ) کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"بالکل سچ میرے لال"۔

"کیا بات کیا ہے؟"

"بس اب تو یہاں حکومت کرے گی"

"وہ کیسے؟"

"ابھی مہاراجہ نے مجھے بلایا تھا"

"ہاں تو؟"

"اسی لئے بلایا تھا، کہہ رہے تھے، کہہ رہے تھے میں گلبدن کو اپنا بنانا چاہتا ہوں"۔

"پھر تم نے کیا کہا اماں؟"

"میں نے کہا اپنی پھول سی بیٹی دے تو دوں تمہیں لیکن تم کیا دو گے سرکار؟"

"پھر کیا بولے وہ؟"

"کہنے لگے جو مانگو"

"کیا مانگا تم نے؟"

GLOBOS LIBRARY 150/3, Bihar Colony, KARACHI.

"میں نے کہا دو لاکھ روپیہ نقد لوں گی، پانچ ہزار مہینہ میری گلبدن کو اور دو ہزار روپیہ ماہوار مجھے دینا پڑے گا"۔

"کیا کہا پھر مہاراجہ نے؟"

"منظور کر لیا"۔

"ارے! منظور کر لیا؟"

"ارے پھر بھی سستے چھوٹے، میری گلبدن کی قیمت دے کون سکتا ہے وہ تو ان مول ہے ان مول"۔

"پھر اب کیا ہوگا اماں"

"پگلی کہیں کی ہوگا کیا، دھوم دھڑاکے سے مہاراجہ تجھے لے جائیں گے ایک الگ محل دیں گے تجھے اور رانی کی طرح رکھیں گے"

"تم کہاں رہو گی؟"

"میں یہیں رہوں گی، اپنی بیٹی سے ملنے کبھی کبھی آجایا کروں گی"۔

"(ٹھنک کر) نہیں، ہم تو کہیں الگ نہیں رہنے دیں گے، مہاراجہ نہیں مانیں گے تو میں محل سے بھاگ آؤں گی تمہارے پاس اور پھر جاؤں گی نہیں وہاں"۔

یہ محبت بھرے جملے سُنکر موتی کا حال وفورِ مسرت سے بے حال ہوا جا رہا تھا، ایسی سعادت مند، خوش اطوار اور وفادار اولاد قسمت سے ملتی ہے

دوسرے روز بڑے اہتمام سے گلبدن مہاراجہ کے نوتعمیر محل میں، جس کا نام ہی "نیا محل" تھا پہنچا دی گئی، مہاراجہ نے بڑے چاؤ سے گلبدن کو اپنایا تھا، اسکی اُنھوں نے مُنہ مانگی قیمت دی، پھر بھی وہ سمجھ رہے تھے کہ سستا سودا ہو گیا، ورنہ گلبدن کی قیمت تو ہفت اقلیم کا خراج بھی نہیں تھا، دو لاکھ روپیہ تو اُنھوں نے نقد دیا، پھر جب وہ "توشہ خانہ" میں داخل ہو گئی تو لاکھوں روپیہ کے زیورات اور ہیرے جواہر سے اسکی ہمت افزائی کی گئی۔

مہاراجہ گلبدن کو بہت چاہتے تھے، وہ پیار سے اُسے "ملکہ قلوپطرہ" کہا کرتے تھے، فرماتے تھے، چابک دست مصوروں کی کھینچی ہوئی۔ جو تصویریں میں نے قلوپطرہ کی دیکھی ہیں، انہیں اور گلبدن کی تصویر کو ملا کر رکھدیا جائے، تو دیکھنے والا امتیاز نہیں کر سکتا، قلوپطرہ کون ہے اور گلبدن کون؛ وہی دلمیں اتر جانے والی آنکھیں، وہی دل میں گھر کرنے والا چہرہ، وہی دل کو تڑپا دینے والی ادائیں، وہی دل کو بیقرار کر دینے والی آواز، وہی دل کو لوٹ پوٹ کر دینے والے انداز، وہی کشیدہ قامت، وہی سرو سہی قد، بس یہ معلوم تھا کہ قلوپطرہ کی رُوح اپنی رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ گلبدن کے بدن میں حلول کر آئی ہے، خوش قسمتی سے وہ تناسخ کے قائل بھی تھے، اسلئے انہیں یقین کامل تھا کہ موتی کے ہاں قلوپطرہ نے جنم لیا ہے۔

قلوپطرہ، یا گلبدن کو پا کر مہاراجہ سب کو بھول گئے تھے، یہ وہ گراں مایہ چیز انہیں بخت و اتفاق سے مل گئی تھی، کہ ہر چیز کی قیمت ان کی نگاہ سے اتر گئی تھی۔

ایک روز نئے محل کے سامنے والے لان پر شام کے وقت مہاراجہ بیٹھے ہوئے تھے، گلبدن بھی موجود تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ کی مہربانیوں سے وہ تھوڑے سے ہی دنوں میں کچھ سے کچھ ہو گئی تھی، مہاراجہ نے اس سے پوچھا،

"قلوپطرہ ایک بات بتاؤ گی؟"

"پوچھیے سرکار"

"تم مجھ سے، میرے ساتھ زندگی بسر کرنے سے خوش ہو۔"

"بہت خوش سرکار"

"دیکھو سچ سچ کہنا۔"

"مہاراجہ میں جھوٹ نہیں بولتی"

"میری حالت تو عجیب ہو گئی ہے۔"

"کیا ہو گئی ہے آپ کی حالت؟"

"تمہارے بغیر زندگی روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہونا بھی چاہیئے۔"

؎ اُلفت کا جب مزہ ہے کہ دونوں ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی!

"آپ نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، کیا میں اسے بھول سکتی ہوں"۔
"تم نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا کیا میں اسے بھول جاؤں گا؟"
"میں کچھ نہیں تھی، آپ کی ایک نگاہ نے مجھے سب کچھ بنا دیا"۔
"میں بہت کچھ تھا، سب کچھ تھا، لیکن تم سے نگاہ ملتے ہی کچھ بھی نہ رہ گیا"۔

"سرکار چلیے کشمیر چلیں"
"یہ تو میں خود کہنے والا تھا کہ اس ہنگامہ کی دُنیا سے الگ کہیں اور کسی کُنج میں خاموش اور سنسان مقام پر ہم دونوں جائیں، کچھ دن وہیں رہیں دُنیا کے ہنگاموں سے ہمارے کان آشنا نہ ہوں، آواز آئے تو تمہارے نغمۂ جاںفزا کی، دید ہو تو تمہارے حسنِ دلکش کی، کام ہو تو صرف تم سے، یہ ہر وقت مہاراجہ مہاراجہ کہنے والی دُنیا سے میں گھبرا گیا ہوں ضرور چلو کشمیر"۔

اسی روز سامانِ سفر تیار ہوا، اور مہاراجہ بہت مختصر عملہ کے ساتھ گلبدن کو لے کر کشمیر کے سفر پر روانہ ہو گئے، اس سفر کی یہ خصوصیت تھی کہ موتی بھی ہمرکاب نہ تھی، حالانکہ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن نہ گلبدن نے اصرار کیا، نہ مہاراجہ نے اپنے قافلہ میں مزید اضافہ

مناسب سمجھا۔

کشمیر کی گل پوش وادیوں، دِل آرا سبزہ زاروں، دِل افروز آبشاروں دِل رُبا کوہساروں کا عالم ہی کچھ اور تھا، مہاراجہ اور گلبدن آن واقعی فکر و پریشانی کے جہنم سے نکل کر بے فکری اور نشاط کی جنت میں پہنچ گئے تھے۔

خود کشمیر بھی ایک حُسن زار خطّہ ہے، یہاں حسن کے بڑے بڑے نقاد اور جوہری آتے ہیں، اور اپنی پسند کا سامان خریدتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔

لیکن مہاراجہ کے زہد و تقویٰ کی داد دینی چاہیئے، کہ انہوں نے یہاں کے چلتے پھرتے حسین اور خوبرو سستے اور گراں مایہ حُسن کے سوداگروں سے بات چیت بھی نہ کی، ملکہ قلوپطرہ نے انہیں اتنا مستغنی اور بے نیاز کر دیا تھا اب اُن کی نگاہ میں حُسن جچتا ہی نہ تھا، اب انہیں کوئی حسین اور خوبرو دکھائی ہی نہیں دیتا تھا، اب اُن کے نزدیک ساری دُنیا بدصورت تھی، خوبصورتی سمٹ کر صرف گلبدن آن میں آگئی تھی۔

اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ مہاراجہ کشمیر کی سیر کر چکے تھے، یہاں آن کے مخصوص نیاز مندوں اور اُن کی قدردانیوں اور سرپرستیوں پر زندہ رہنے والی ایک مختصر جماعت بھی موجود تھی، اس لیے جیسے ہی سُنا کہ مہاراجہ نے قدم رنجہ فرمایا ہے،، دوڑی اور ان کی پسند کی تصویریں الفاظ کی مدد سے

بنا بنا کر پیش کرنے لگی، لیکن مہاراجہ نے اُن لوگوں سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ اُنہیں اب اسکی ضرورت ہی نہیں تھی کہ حسن کے سوداگر اور ایجنٹ اُن سے ملیں، اُنہیں پرچائیں، اُنہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کریں یہ سب اُمیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ آئے تھے، بڑی محرومی اور یاس کے ساتھ واپس آگئے،

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم!

کشمیر کا سفر ختم ہوا، اور مہاراجہ پھر سورج پور پہنچ گئے۔

گلبدن اب مہاراجہ پر راج کر رہی تھی، وہ اپنی ریاست پر فرمانروائی کرتے تھے، اور گلبدن اُن کی مملکت دِل پر شہنشاہی کرتی تھی، اسی طرح سے دن گذرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا مہاراجہ نے اب گناہوں سے توبہ کر لی ہے، اب اُن کی زندگی میں نیا انقلاب ہوا ہے، نہایت خوشگوار انقلاب،

لیکن انقلاب کا آغاز جتنا شاندار ہوتا ہے انجام اتنا ہی حسرتناک ہوتا ہے، یا تو یہ حال تھا کہ گلبدن کے بغیر مہاراجہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ اور یا وہی مہاراجہ تھے جو کئی کئی روز تک محل کا رُخ نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی روز جاتے بھی تھے تو مسافر کی طرح، مسافر کتنے ہی شاندار ہوٹل میں ٹھہرے، لیکن سفر اس پر سوار رہتا ہے، جہاں جہاں بھی وہ قیام کرے، یکسوئی اور اطمینان سے اسے بیر رہتا ہے۔

گلبدن نہایت غور سے مہاراجہ کی اس تبدیلی کو دیکھ رہی تھی، وہ ملول وافسردہ نہیں تھی، اسلئے کہ اب وہ کافی ہوشیار اور سمجھدار ہو چکی تھی، وہ پریشان ضرور تھی، وہ اب کنج قفس سے باہر نکلنا چاہتی تھی، لیکن کس طرح؟ آخر،

قفس کی تیلیاں توڑیں تڑپ کر
نہیں آتا انہیں آزاد کرنا!

موتی اگرچہ اب "پنشن" پا چکی تھی اور درباری پابندیوں سے آزاد تھی لیکن اسپر بھی یہ پابندی تھی کہ بغیر سرکاری اجازت کے وہ حدود ریاست سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی، وہ اپنے پرانے مرکز، لکھنؤ اکثر تقریبات کے سلسلہ میں جایا کرتی تھی۔

اب کی پھر اُسنے، مہاراجہ سے چند روز کے لئے لکھنؤ جانے کی اجازت طلب کی، جو فوراً مل گئی۔ لیکن جب اُس نے اپنے ساتھ گلبدن کو بھی لے جانے کی اجازت مانگی تو وہ فوراً مسترد کر دی گئی۔ موتی مہاراجہ کے حضور میں آئی اس نے کہا، سرکار اس لونڈی کے بال حضور کی خدمت میں سفید ہوگئے ہیں، آج تک کوئی حرکت ایسی سرزد نہیں ہوئی کہ اسکی وفاداری پر دھبہ لگ سکے میں اپنی بھانجی کی ایک تقریب میں جا رہی ہوں، گلبدن نے برسیں ہوگئیں سورج پور سے قدم باہر نہیں نکالا، دُور دُور کے عزیز اور رشتہ دار اس تقریب میں آئیں گے، میری بہن کا اصرار ہے کہ گلبدن کو ضرور ساتھ

لانا، ورنہ تم بھی نہ آنا، پھر کیا حضور اس لونڈی پر اتنا بھروسہ بھی نہیں کرتے کہ وہ میرے پاس چند دن لکھنؤ میں رہ سکے؛ حالانکہ جس حفاظت سے میں نے ۹ مہینہ تک اسے پیٹ میں رکھا ہے اس سے زیادہ احتیاط کے ساتھ اسے لکھنؤ میں رکھوں گی۔

مہاراجہ، موتی کی ان باتوں سے ذرا پسیجے، اُنہوں نے اجازت دیدی اور تاکید کردی کہ دس روز کے اندر مع گلبدن کے سورج پور واپس آجانا۔

دوسرے روز موتی لکھنؤ جانے کی تیاریاں کرنے لگی، جتنا ضروری سامان تھا وہ اُس نے اپنے بھائی کے ہاتھ پہلے ہی بھیج دیا، وہ "ہلکی پھلکی" جانا چاہتی تھی۔ گلبدن آئی، اُس نے پوچھا۔ اماں، کب چلوگی لکھنؤ؟ موتی مسکرائی، اُسنے کہا بٹیا اب دیر کیا ہے،

اب ہم بھی چلنے والے ہیں سامان تو ہو گیا۔

کل چلو،

اسی قرار کے مطابق دوسرے روز موتی اور گلبدن کی سواری لکھنؤ کی طرف روانہ ہو گئی۔

موتی نے تمام نقد روپیہ اور قیمتی سامان چپ چپا کے پہلے سے لکھنؤ بھیجدیا تھا، اب چلتے وقت اپنا سب سے قیمتی سرمایہ . . . گلبدن . . . بھی لیتی آئی، یہاں انتظامات پہلے سے مکمل ہو چکے تھے، ایک شاندار بالاخانہ

پر موتی کی سرپرستی میں گلبدن رونق بالائے بام بن کر بیٹھ گئی۔

اپنے شاندار "پس منظر" کے ساتھ گلبدن جو بالاخانہ پر بیٹھی تو لکھنؤ کے من چلوں کا تانتا لگ گیا، گلبدن نے اپنی دوکان ایک مغنیہ کی حیثیت سے کھولی تھی، لکھنؤ میں موسیقی کے قدر دانوں کی کمی نہیں ہر وقت اس کے ہاں میلہ سا لگا رہتا، روپیہ کی پہلے بھی کمی نہیں تھی اور اب بھی اولوں کی طرح اس کے ہاں سنہری اور روپہلی ٹکلیاں برسا کرتی تھیں۔

رفتہ رفتہ یہ خبر مہاراجہ کو بھی پہنچی، معلوم ہو گیا کہ مرغ زریں اڑ گیا گھبرائے، بدنامی سے ڈرے، کفِ افسوس ملا کہ "قضیۂ زمیں برسرِ زمیں" پر عمل کر کے یہیں موتی اور گلبدن دونوں کا فیصلہ کیوں نہ کر دیا؟ آدمی دوڑائے کہ ترغیب یا تہدید، انعام کا لالچ یا سزا کا خوف ۔ ۔ ۔ جس سے کام چلے، فوراً دونوں کو واپس لاؤ۔

لیکن ہر کوشش ناکام ہوئی، ترغیب دینے والوں سے موتی نے کہا، اللہ نے دال روٹی بھر کا دے رکھا ہے، ہمیں نہیں چاہیئے مہاراجہ کا روپیہ تہدید سے کام نکالنا جن لوگوں نے چاہا، اُن سے گلبدن نے کہا، میں بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ آتے ہی میں نے پولیس میں رپورٹ کر دی تھی کہ مہاراجہ کے ظلم سے تنگ آ کر میں لکھنؤ آ گئی ہوں، اور اب میں سورج پور جانا نہیں چاہتی پولیس پہلے سے چوکنی تھی، اب میں گورنر صاحب کو خط لکھتی ہوں کہ مہاراجہ

اپنے آدمیوں سے ہمیں دھمکی دے رہے ہیں، آپ کی رعایا ہوں جان بچانے کے لئے دُہائی کس کی دوں؟

اور دے واپس گئے، گلبدن نے واقعی حکومت کو خط لکھ کر مہاراجہ کے سارے کرتوتوں کا راز افشا کر کے جان و مال کی امان چاہی، فوراً مہاراجہ کے پاس تحقیق احوال کے لئے حکومت کی طرف سے مراسلہ گیا، اب ذرا مہاراجہ بھی دبلے، اُنہوں نے سوچا اب اگر اُنہوں نے کوئی کارروائی موتی یا گلبدن کے خلاف کی، تو حکومت ضرور اسمیں دخل دے گی، ان بدمعاشوں نے پہلے ہی سے اُسے متاثر کر دیا ہے۔ لہٰذا بہتر چارۂ کار یہی ہے کہ لعنت بھیجی جائے ان نمک حراموں پر،

گلبدن کی دوکان زوروں پر جا رہی تھی کہ نواب رفعت مآب سے "اِنگیجمینٹ" ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ ہزار ماہوار پر وہ ان کے ہاں خانہ نشین ہو گئی۔

اب بالاخانہ کی جو کچھ رونق تھی وہ موتی کے دم سے تھی لیکن اب وہ بھی کیا؟

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی

باب
(۱۶)
نگاہِ یار

مشرقی شاعر نے نگاہِ یار کی جو توصیف کی ہے، وہ یہ ہے کہ نگاہِ یار
نا آشنائے مہر و مروت ہوتی ہے۔ وہ کبھی تیر و پیکاں بن جاتی ہے،
کبھی علاج و مرہم، کبھی اسمیں سے شرارے نکلنے لگتے ہیں، اور کبھی رحم و کرم
کی بارش ہونے لگتی ہے۔ اسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں کمال ہے
اسپر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا، وہ کبھی قاتل بن جاتی ہے، کبھی جاں بخش،

کبھی بلا کو بن جاتی ہے، کبھی مسیحا کبھی زہر کبھی تریاق، یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کب وہ شمشیر و خنجر کا کام کرے گی اور کب وہ آبِ حیات بنکر مُردہ دلوں کو حیاتِ نو عطا کرے گی۔

بالکل یہی حال مہاراجہ صاحب کا تھا، اُن کی نگاہ بھی نگاہِ یار تھی جو نہ وفاداری کی گرویدہ تھی، نہ بے وفائی کی شکوہ سنج، نہ جاں نثاری کی قدرداں تھی نہ خود غرضی سے بیزار، نہ اپنا کوئی اصول رکھتی تھی نہ معیار، جسے آسمان کی طرح رنگ بدلنے میں دیر نہیں لگتی تھی، جو آن کی آن میں بجلیاں برسانے لگتی تھی، اور زندگی کی، امید کی، آرزو کی کھیتیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی تھی۔ جو اچانک طور پر جود و کرم کی بارش کرتی تھی، جس سے کنگال سرمایہ دار ہو جاتے تھے، خطاکار نیکوکاروں کو آنکھیں دکھانے لگتے تھے، قطعاً نہیں کہا جا سکتا تھا کب مہاراجہ کی نگاہ کیا کرنے لگے گی، جس طرح محیر العقول ترقیوں کے باوجود سائنس اب تک کوئی ایسا آلہ نہیں ایجاد کر سکی، جو پہلے سے یہ بتا دے کہ اب زلزلہ آنے والا ہے، اسی طرح انسانی عقل مہاراجہ کی نگاہ کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کر پاتی تھی کہ وہ برقِ جانسوز بن رہی ہے یا ابرِ رحمت ؟

کرنل بھاگ ناتھ جب تک زندہ رہے، مہاراجہ کی ناک کے بال بنے رہے، آدمی تھے بھی یار شاطر، جس محفل میں پہنچ گئے اسے کشتِ زارِ زعفران بنا دیا، باتیں کرتے وقت ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے، روتوں کو

ہنسا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کمال تھا، بڑے حاضر جواب، بذلہ سنج، اور پُر لطف آدمی تھے، مہاراجہ اُن سے اتنے خوش تھے کہ اُن کے اشارۂ چشم پر چلتے تھے، یہ معلوم ہو جائے کہ کرنل صاحب کی یہ خواہش ہے، پھر کیا مجال جو وہ پوری ہو کر نہ رہے، مہاراجہ صاحب نے کرنل صاحب کو شاہی جاگیر کا منتظم بھی مقرر کیا تھا، اُن کے دو لڑکوں کو اچھی سرکاری ملازمتیں دلادی تھیں ان کی لڑکی کی شادی میں خود شریک ہوئے تھے، کئی ہزار روپے کے تحائف دیئے اور ان کے داماد کو بھی ایک معقول ملازمت عطا فرمادی تھی،

سرطان کے مرض میں کرنل صاحب بیمار ہوئے، پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا ہر قسم کا علاج ہوا، ڈاکٹر، حکیم، وید سب ہی نے اپنی سعی کر ڈالی، لیکن آیا ہوا وقت کب ٹلتا ہے، آخر کرنل صاحب اس جہانِ تمنا سے رخصت ہو گئے وفات سے کچھ پیشتر انہوں نے مہاراجہ کے قدموں پر اپنی بیوی کا سر رکھوایا تھا، اور فرمایا تھا، میری زندگی کا چراغ گل ہو رہا ہے، میں اب نہیں بچوں گا، سرکار، آپ اگر کرپا کریں گے تو اس خاندان کا بیڑا پار لگ جائے گا مہاراجہ نے بڑی حاکمانہ شفقت سے فرمایا، پاگل ہوئے ہو، بھاگ نا تجربہ کار جاؤ گے تم، گھبرا گئے کیوں ہو؟ اور اگر موت آہی گئی ہے، تو اطمینان رکھو تمہارا گھر میرا گھر ہے، تمہارے بال بچوں کے دیکھ بھال کا میں پورا خیال رکھوں گا۔ تسکین و تسلی کے یہ کلمات سنکر کرنل صاحب کی آنکھیں وفورِ مسرت

سے چمک اٹھیں، انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں شکریہ ادا کیا، جسے مہاراجہ نے بھی محسوس فرمایا، کہا "یہ میرا فرض ہے!"

کرنل صاحب کی وفات کے بعد فوراً دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مہاراجہ نے ان کی بیوہ کے لئے مقرر کر دیا، کرنل صاحب کو جو جاگیر عطا کی تھی، وہ بحال رکھی، جو مکان دیا گیا تھا وہ بھی اُن کے پسماندگان کے قبضہ میں رہا، اور یہ غمزدہ خاندان نسبتاً سکھ اور چین کی زندگی مہاراجہ کے سایہ میں بسر کرنے لگا۔

لیکن چھ مہینہ کے بعد، دفعتاً مہاراجہ کو خیال آیا "یہ خاندان تو ضرورت سے زیادہ نفع اٹھا رہا ہے ہماری مہربانی سے!" فوراً ہی حاضرین محفل نے بصد ادب اسکی تائید کی، نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل صاحب کی بیوہ کی پنشن ضبط ہو گئی، اُن کی جاگیر واپس لے لی گئی، ان سے مکان خالی کرا لیا گیا اُن کے دونوں بیٹوں کو نالائقی کے جرم میں برطرف کر دیا گیا، اور اُن کے دا [illegible] غفلت کے الزام میں سزاوار ملازمت نہ سمجھا گیا، یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔

کرنل صاحب کی بیوہ نے حضور میں باریاب ہونا چاہا، اجازت نہ ملی، ان کے صاحبزادوں نے درخواستوں پر درخواستیں دیں، جواب نہ ملا، اُن کے داماد نے بڑی پرزور اپیلیں کیں، لیکن،

؎
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

آج اس خاندان کو معلوم ہوا کہ کرنل صاحب واقعی مر گئے، اور ان کے روحانی تصرفات کا سلسلہ بھی بند ہو گیا، یا تو یہ حال تھا کہ اس خاندان کے دم سے مچھندر کے پیٹ بھرتے تھے، یا یہ حالت ہو گئی کہ خود یہ خاندان قحط کا عین اسوقت شکار ہو گیا، جبکہ کھیتیاں لہلہا رہی تھیں، اناج کی ریل پیل تھی، مہاراجہ کے گودام میں اناج سڑ رہا تھا اور دنیا مزے کر رہی تھی،

کرنل صاحب کی جگہ تیواری بابو مامور ہوئے تھے، یہ بھی بڑے ذہین اور طباع آدمی تھے۔

ع مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

پھر بھی مہاراجہ اُن سے بہت خوش تھے، اُن کی خوشی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کرنل صاحب آنجہانی کا سارا "متروکہ" انہیں دے دیا گیا، وہی جاگیر، وہی تنخواہ، وہی مکان، وہی آسانیاں،

صفدر حسین صاحب محکمہ مال کے سکریٹری تھے، مہاراجہ کے منہ لگے تھے، اُن کے طرزِ عمل سے سارا عملہ نالاں تھا، ان کی بداحتیاطیوں سے تمام وزراء بیزار تھے، رشوت علی الاعلان لیتے تھے، قانون کی خلاف ورزی برسرِ راہ کرتے تھے۔ جن لوگوں سے خفا ہوتے تھے، انہیں اُن کے گھروں پر بٹھوا دیا کرتے تھے، جب ضروریات سے زیادہ پریشان ہوتے تھے اور رشوت بھی ناکافی ہوتی تھی، تو اپنے محکمہ پر ہاتھ صاف کرتے تھے، اور جتنی رقم کی ضرورت

ہوتی تھی اسے حساب دوستاں کے کھاتے میں ڈال کر وہ صرف کر لیتے تھے مصارف کی کوئی حد نہیں تھی، ساڑھے تین سو روپیہ تنخواہ تھی اور مصارف کسی طرح ڈیڑھ ہزار سے کم نہیں تھے، شاہانہ دعوتیں، پر تکلف مجلسیں، طوائفوں کا ناچ گانا، مجرا کیا نہیں ہوتا تھا؛

ایک مرتبہ اُن پر دس ہزار روپیہ کے غبن کا الزام لگایا گیا، وزیر مال نے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیا۔ کمیشن نے بڑے غور و فکر سے چھان بین کی، تمام الزامات کی تنقیح کی، کچھ نئے الزامات تصنیف کئے، اور رپورٹ وزیر مال کی خدمت میں ارسال کر دی، اس کمیشن کی سفارش یہ تھی کہ صفدر حسین پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے، اور اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے، وزیر صاحب نے اس رپورٹ کی پُر زور تائید کی اور مہاراجہ کی خدمت میں پیش کر دی، مہاراجہ نے رپورٹ ملاحظہ فرمائی اور اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا وزیر مال کو صاحب کو صفدر سے بڑی کد ہو گئی تھی، وہ مہاراجہ سے بار بار پوچھتے تھے، صفدر نے کیا فیصلہ کیا، مہاراجہ ٹال دیتے تھے، اب کے پھر انہوں نے یہی سوال کیا، مہاراجہ نے کہا میرا فیصلہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد مہاراجہ کا فیصلہ سکریٹریٹ میں ہر شخص کا موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ صفدر برخاست نہیں کیا گیا، اس پر مقدمہ چلانے کی اجازت

نہیں دی گئی، بلکہ اسے چیف سکریٹری بنادیا گیا، اب تک اسکی تنخواہ ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تھی، اب اسے آٹھ سو ماہینہ ملنے لگا، لوگ رشک کررہے تھے اسکی قسمت پر، اندیشہ کیا تھا اور ہوا کیا، سوچا کیا تھا دیکھا کیا!

اکرام صاحب بڑے با اصول آدمی تھے، سورج پور کے سٹی مجسٹریٹ تھے، بڑے ایماندار، بڑے منصف مزاج، بڑے بے ریا شخص تھے، نہ کسی کی سفارش سنتے تھے، کسی پر ظلم ہورہا ہو اور وہ اسے برداشت کرلیں ناممکن، وہ ملزم کو پہلے سے مجرم نہیں سمجھ لیتے تھے، اور مجرم اُن کے کٹہرے سے بچکر نہیں جاسکتا تھا۔

ریاست کے ایک عہدہ دار پر استحصال زر بالجبر کا مقدمہ چلا، حکام کی طرف سے زور ڈالا گیا کہ مقدمہ عہدہ دار کے حق میں فیصل کیا جائے، خود وزیر متعلقہ نے اکرام صاحب کو اشارہ میں بتایا کہ مہاراجہ صاحب کی مرضی بھی یہی ہے، اکرام صاحب سب کی سنتے رہے لیکن بالکل خاموش رہے آخر مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، گواہیاں لی گئیں حالات کی تحقیق ہوئی ملزم کو صفائی کا موقع دیا گیا، لیکن واقعات نے ثابت کردیا کہ وہ مجرم ہے اکرام صاحب نے کسی اثر سے متاثر ہوئے بغیر اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا، اور ملزم کو سزائے قید وجرمانہ دے دی،

اس فیصلے پر حکام اور وزراء کے حلقہ میں کھلبلی مچ گئی، مہاراجہ صاحب

پر برہمی کی کیفیت طاری ہو گئی ، اُنہوں نے فوراً وزیر لا اینڈ جسٹس کو طلب فرمایا ، وہ گھبرائے ہوئے حاضر ہو گئے ۔

"سزا ہو گئی اسے ؟"

"جی سرکار"

"تم نے مجسٹریٹ کو بتایا نہیں تھا"

"میں نے کہہ دیا تھا سرکار"

"پھر ؟"

"اُس نے وہی کیا جو اسکی مرضی تھی"

"اسکی مرضی سب کچھ ہے اور میری مرضی کچھ بھی نہیں ؟"

"حضور کی مرضی ہمارا دین و ایمان ہے" ۔

"پھر ایسے بے ایمانوں کو کیوں رکھ چھوڑا ہے ؟"

"نکال دوں اسے ؟"

"فوراً"

"الزام کیا لگاؤں ؟"

"بالکل بدھو ہو تم ، اگر تم کسی آدمی کو کوئی الزام لگا کر الگ کرنا بھی نہیں جانتے تو ہرگز تم اس قابل نہیں ہو کہ اتنے بڑے عہدہ پر فائز رہو"

"بجا ارشاد ہوا"

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"کیا سوچا تم نے ؟"

"نکال دوں گا اکرام کو"

"الزام کیا لگاؤ گے ؟"

"رشوت کا"

"ثبوت ؟"

"اسکی کیا کمی ہے !"

" پہلے سے کیوں نہیں سوچ لی تھی یہ بات"

"اب میں سمجھ گیا اچھی طرح ، اجازت ہے مجھے ؟"

" ہاں جاؤ تم"

وزیر صاحب نے رختِ سفر باندھا، لیکن مہاراجہ نے پھر پوچھا

"اب سٹی مجسٹریٹ کسے بناؤ گے"

" جیسے حضور فرمائیں"

" تم نے کیا سوچا ؟"

"میری رائے تو شنکر کے بارے میں ہے"

"کون شنکر ؟"

" وہی تیواری بابو کا سالا"

"اسے کچھ تجربہ ہے ؟"

"حضور تجربہ تو کام سے آتا ہے"

"خیر ، کسی کو سہی"

وزیر صاحب واپس گئے . . . اور رشوت ستانی کا الزام لگا کر فوراً اکرام صاحب کو برخاست کر دیا ، انھوں نے ثبوت اور دلیل کے چکر میں الجھنا چاہا ، تو ان سے کہلوا دیا گیا ، خیریت چاہتے ہو تو چپ چاپ ریاست سے باہر چلے جاؤ ، ورنہ ابھی ملازمت گئی ہے ، پھر جان و مال اور آبرو کی بھی خیریت نہیں ہے

اکرام صاحب تھے سمجھدار آدمی ان اشارات سے تفصیل تک ان کا ذہن رسا پہنچ گیا ، اور وہ بیک بینی و دو گوش سورج پور سے روانہ ہو گئے ۔

ڈاکٹر کیدار ناتھ ، ریاست کے سول سرجن تھے ، ان کے ساتھ بھی مہاراجہ صاحب بڑی رعایتیں فرماتے تھے ، تنخواہ بھی معقول تھی ، پرائیویٹ مطب کی اجازت بھی تھی ، بالائی آمدنی مہاراجہ صاحب اور ان کی مہارانیوں کی طرف سے بھی ہوتی رہتی تھی ، غرض بڑے مزے میں زندگی بسر کر رہے تھے وہ !

لیکن فلک کج رفتار کی کج رفتاری برطانوی ہند کے مقابلہ میں ، بعض ریاستوں کے اندر زیادہ تیز ہو جاتی ہے ، سورج پور میں بھی اس کی رفتار شباب پر تھی ، ہر روز ایک نیا فتنہ اٹھتا تھا ، ہر لمحہ کسی نئے ہنگامہ کا آئینہ دار ہوتا تھا ، ہر ساعت کسی نئے حادثہ کی حامل ہوتی تھی ۔

کہاں تو ڈاکٹر صاحب ، مہاراجہ کی جان کے امین بنے ہوئے تھے ،

کہاں خود مہاراجہ بندوق تان کر ان کے سینہ پر وار کرنے کے لئے نکل آئے، میدان میں، ہوا یہ کہ ان کے محل کی ایک خادمہ کا آپریشن ہوا مہاراجہ صاحب نے پہلے سے تاکید کر دی تھی کہ اپریشن "کامیاب ہونا چاہیئے" اور ڈاکٹر صاحب نے بھی خدا پر بھروسہ کر کے اسکا وعدہ کر لیا تھا، لیکن آپریشن ناکام ہوا، اور وہ مر گئی۔ یہ اتنا بڑا جرم تھا ڈاکٹر صاحب کا کہ خود انکی جان خطرہ میں پڑ گئی مہاراجہ نے فوراً فیصلہ کر دیا کہ اتنا نالائق آدمی میری ریاست کا سول سرجن نہیں بنایا جاسکتا اور اس فیصلہ کے ساتھ ہی حکم دے دیا کہ ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر ریاست سے باہر نکل جاؤ۔

ڈاکٹر صاحب بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے، اعلیٰ درجہ کا فرنیچر تھا، قیمتی سامان تھا یہ سب کچھ وہ ۲۴ گھنٹہ میں کیونکر بیچ سکتے تھے اور اس مدت کے اندر اندر انہیں بہر حال ریاست کے حدود سے باہر نکل جانا تھا آخر انہوں نے اپنا ہزاروں روپیہ کا قیمتی سامان، ظروف، فرنیچر، اونے پونے فروخت کیا اور نقد جان لے کر سورج پور سے باہر نکل آئے ؞

باب
(۱۲)
نئی شادی!

کنور جسونت سنگھ بہت بڑے تعلقہ دار تھے، تین لاکھ سالانہ کی آمدنی کا تعلقہ تھا، ذہین اور طباع بھی بہت تھے، باپ دادا کی اس جاگیر پر وہ قناعت نہیں کرتے تھے، بمبئی میں، اُن کے کئی طویلے تھے، جہاں بڑے قیمتی گھوڑے موجود رہتے تھے، یہ گھوڑے ریس میں دوڑائے جاتے تھے "سیزن" میں اُن کے کئی گھوڑے "ون" آتے تھے، اور اس طرح وہ بے اندازہ

دولت کما لیتے تھے، ریس کے وہ بڑے ماہر تھے، ان کی مہارت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ریس جیسے خانہ خراب شغل میں وہ کھوتے کم تھے اور پاتے زیادہ تھے، ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی نشست میں پچاس ہزار روپیہ ہارتے تھے، اور ایسے مواقع بھی پیش آتے تھے کہ ایک ہی نشست میں ایک لاکھ روپیہ جیت گئے، غرض تنخواہ کی آمدنی کے علاوہ دوسرے ذرائع آمدنی بھی تھے، اور ان سے بھی وہ بلا مبالغہ لاکھوں روپیہ کماتے رہتے تھے۔

آج "ڈاشر لئے کپ" تھا معمول سے کہیں زیادہ ہجوم ریس کے شغل میں حصہ لے رہا تھا، اور خواص کی تعداد بھی حد شمار سے خارج تھی،

بمبئی کا "ٹرف کلب" جسکی نگرانی اور ماتحتی میں ریسیں ہوتی ہیں عجیب و غریب دنیا اپنے اندر آباد رکھتا ہے۔

> بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
> کسے را با کسے کارے نباشد

یہی حال "ریس کورس" کا ہوتا ہے، لاکھوں کا مجمع ہے، اس مجمع میں بڑے گہرے دوست، پرانے شناسا اور بچپنے کے ساتھی بھی موجود ہیں، لیکن کیا مجال جو کوئی کسی کی طرف متوجہ ہو جائے، سب اپنی فکر میں مست ہیں، سب اپنی دھن میں مگن ہیں، ہر شخص کو خیال ہے تو یہ کون گھوڑا جیتے گا کس پر وہ قسمت آزمائی کرے؟

ریس کورس میں جہاں عوام کا انبوہ درانبوہ ہوتا ہے، وہاں خواص کا بھی بہت بڑا مجمع ہوتا ہے، بڑے بڑے والیانِ ریاست جن کے درشن کو آنکھیں ترستی ہیں، ریس کورس پر، پوری بے تکلفی اور بے حجابی کے ساتھ محوِ خرام نظر آئیں گے۔ بڑے بڑے سیٹھ اور ساہوکار جن سے ملاقات کا ارمان ہی لوگوں کے دلوں میں رہتا ہے، اس میدان میں ہرن کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں، بڑی بڑی نامی گرامی فلم ایکٹرسیں جن کا پردہ سیمیں کے علاوہ کہیں اور دیدار نہیں ہوتا، کبکِ دری کی طرح ریس کے میدان میں رواں دواں نظر آئیں گی حسن و جمال کے مرقعے، جن پر خود دستِ قدرت کو ناز ہوگا، اس بازار میں بر افگندہ نقاب گھومتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس بڑے مجمع کا بڑا حصہ تو وہ ہوتا ہے جو صرف "ہار جیت" کے لئے جاتا ہے۔ اسے گھوڑوں کے سوا کسی سے سروکار نہیں ہوتا وہ اپنے پسندیدہ گھوڑوں کا اس طرح نظارہ، امید و یاس کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرتا ہے جیسے مجنوں کے لئے لیلیٰ، فرہاد کے لئے شیریں،

لیکن ایک مختصر مجمع وہ بھی ہوتا ہے، جو کم خرچ بالانشیں "کے اصول پر عمل پیرا ہوتا ہے، اُسے ریس سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی، اس کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ ریس کے ساتھ ساتھ اپنا اصل کام یعنی نظارۂ جمال جاری رکھے، مہاراجہ صاحب اس آخری گروہ سے تعلق رکھتے تھے، وہ ریس کے

شائق نہیں تھے، حسنِ رہ گذر کے حسنِ رنگ رنگ کے، حسنِ بے پروا اور حسنِ خود آرا کے، حسنِ برہم اور حسنِ مخمور کے، حسنِ خود فروش" اور حسنِ خود فراموش کے، حسنِ زردار، اور حسنِ نادار کے شائق تھے اور یہ جنس فراوانی کے ساتھ صرف اس کے میدان ہی میں مل سکتی ہے۔

مہاراجہ کے پہلو میں کنور جسونت سنگھ تشریف فرما تھے، اور اُن کے پاس ان کی بڑی صاحبزادی کماری اوشا بیٹھی ہوئی تھیں، اسی سال انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تھا، کنور صاحب بڑے اشتیاق سے مہاراجہ سے ملے، اپنی صاحبزادی کا تعارف کرایا، اب تک کنور صاحب سنگ حائل بنے ہوئے تھے تعارف کے بعد وہ کونہ میں بیٹھ گئے، انکی جگہ اوشا نے لے لی، مہاراجہ اور اوشا میں باتیں چھڑ گئیں، کنور صاحب نے دور بین اٹھائی، اور گھوڑوں کی سبک خرامی کا مشاہدہ فرمانے لگے۔

ریس کے میدان میں گھوڑے دوڑ رہے تھے، مہاراجہ کے سینہ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

ع۔ خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا!

اوشا ایک اعلیٰ خاندان کی چشم و چراغ تھی حسن و جمال کی دولت بھی اسے قدرت نے فیاضی کے ساتھ بخشی تھی، پہلی ہی ملاقات میں مہاراجہ صاحب اس سے کافی متاثر ہو گئے تھے، وہ تھی بھی ایسی ہی چیز، سادگی اور پرکاری کا مرقع، رنگ گورا

اور بے التفاتی کا مظہر، توجہ اور بے پروائی کا نمونہ، مہاراجہ کو وہ بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسپر تیار نہیں تھی کہ اُن کی آلۂ کار بن جائے، مہاراجہ نے ایک بات کہی، اُس نے اُسے فوراً کاٹ دیا، مہاراجہ نے ایک اصول پیش کیا، اُسنے فوراً اسکی تردید کر دی، مہاراجہ نے فلسفۂ الفت پر اظہار خیال کرنا چاہا، وہ ریس کے دوڑتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھنے لگی، یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مہاراجہ صاحب اسپر عاشق ہو گئے تھے، لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ اسکی طرف مائل تھے، اور ان کا میلان بڑھتا جاتا رہا،

ریس ختم ہوتی یہ مجلس برخاست ہونے لگی، کنور جسونت سنگھ نے مہاراجہ سے مصافحہ کیا، اوشا لے ہاتھ ملایا، مہاراجہ صاحب رخصت ہوئے، رخصت ہوتے ہوتے انھوں نے کنور صاحب اور اوشا کو اپنے دولت کدہ پر آنے کی دعوت دی جو تشکر و سپاس کے جذبات کے ساتھ قبول کر لی گئی۔

. . . . رفتہ رفتہ مہاراجہ کے دولتکدہ پر ان لوگوں کی آمدو رفت بڑھ گئی، آمدورفت کے ساتھ ساتھ مراسم اور روابط میں بھی استحکام پیدا ہونے لگا، مہاراجہ کی طبیعت گھبرائی انہوں نے ٹیلیفون اٹھایا اور اوشا سے باتیں شروع کر دیں، اوشا کی طبیعت لہرائی، اور وہ مہاراجہ کے ہاں پہنچ گئی،

دونوں تعلیم یافتہ تھے، اعلیٰ سوسائیٹیوں کے رکن تھے، جہاں دیدہ اور

مصروف و گرم جستجو تھے، اپنے مخصوص تجربے اور مشاہدے رکھتے تھے، اپنے مطالعہ کی بنا پر اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنیادوں کو مستحکم کر گئے تھے، ان دونوں کی ملاقات صرف یہی نہیں تھا کہ عشق و محبت کا ایک ڈرامہ تھی، اس ڈرامہ کا ایک سین یہ بھی تھا، لیکن صرف یہی نہیں، کچھ اور بھی!

سیاسیات و اقتصادیات پر اخلاقیات اور نفسیات پر، غربت و امارت پر، انسانی کردار کی پستی اور بلندی پر، انسانی ضروریات کی کمی اور زیادتی پر گھنٹوں ان دونوں میں بحثیں ہوا کرتیں، کبھی مہاراجہ ہار مان لیتے کبھی اوشا خاموش ہو جاتی، ان دونوں کے مراسم کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اب درمیان کا حجاب اٹھتا جا رہا تھا، اور اسکی جگہ خلوص باہمی لے رہا تھا، اب یہ دونوں صرف ایک دوسرے کے دوست نہیں تھے، بلکہ خیر سگال اور بہی خواہ بھی تھے، مہاراجہ کو اسکی فکر رہتی تھی کہ اوشا کہاں کہاں جاتی ہے، اس سے کون ملتا ہے؟ اس کا لباس کیسا ہے اور کیسا ہونا چاہیئے؟ اسے کہاں جانا چاہیئے اور کہاں نہ جانا چاہیئے: وہ ان سے جلد جلد کیوں نہیں ملتی؟ دیر دیر میں کیوں ملتی ہے، وہ کبھی طبیعت کی ناسازی کا عذر کرتے ہیں، تو اس کے چہرے پر اضطراب کیوں نہیں پیدا ہو جاتا، وہ اگر دو دو دن اسے ٹیلی فون نہیں کرتے تو خود اوشا کیوں نہیں اشتیاق ملاقات ظاہر کرتی؟

اسی طرح اوشا سوچنے لگی تھی کہ مہاراجہ اسے اپنی ہوس رانی کا کھلونا بنانا

چاہتے ہیں یا اپنے دل میں اسکی کچھ جگہ بھی رکھتے ہیں؛ وہ اس سے ایک رندِ مشرب، اور شاہد باز آدمی کی طرح ملتے ہیں یا اپنے دِل کے گوشہ میں اسکی محبت اور الفت بھی رکھتے ہیں؛ وہ اس سے چاہتے کیا ہیں؛ اس بے تکلفی کا انجام کیا ہوگا؛ اس راہ و رسم کا مقصد کیا ہے؛ اس ربط ضبط کی انتہا کیا ہوگی؛ اس میل جول کا ڈراپ سین کیسا ہوگا؛ کتنی داشتہ ہیں؛ کتنی لونڈیاں ہیں؟ کتنی وہ خادمائیں ہیں جو "دربار سرکار" وقف ہیں؛

کیا ان سب کے جھرمٹ میں میری جگہ نِکل سکے گی؛ اور نکل بھی آئے تو وہ قائم رہ سکےگی؛ یا اور اسی طرح کی دُوسری باتیں اوشا کے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھیں، وہ بڑی الہڑ لڑکی تھی لیکن اب سوچتے سوچتے فلسفی بنتی جارہی تھی، ہر وقت سوچنا، ہر بات کو سوچنا، ہر پہلو کو سوچتے رہنا، یہ اسکی طبیعت ثانیہ بنتی جا رہی تھی،

کنور جسونت سنگھ ایک غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے، حال کے آئینہ میں مستقبل کا نظارہ کر رہے تھے، اور بہت خوش تھے، اُن کا اصول یہ تھا کہ نہ مہاراجہ کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ نہ اوشا کی ہمت شکنی کرتے تھے، دھارے کو بہنے کا موقع دے رہے تھے، اور دیکھ رہے تھے، یہ کہاں رُکتا ہے، کہاں گرتا ہے؛

ایک روز ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، مہاراجہ اس طرح لپکے جیسے بچہ مٹھائی

پر لپکتا ہے،

"ہلو"

"ہاں میں ہوں"

"کہو اوشا مزاج تو اچھا ہے؟"

"میں تو خود ابھی تمہیں ٹیلیفون کرنے والا تھا"

"ہاں ایک خاص کام تھا"

"نہیں ٹیلیفون پر نہیں کہہ سکتا"

"تمہیں یہاں آنا پڑے گا"

"جب چاہو آجاؤ"

"میں آج دن بھر یہیں رہوں گا"

"ابھی آتی ہو؟"

"آؤ، آؤ ابھی آؤ"

مہاراجہ نے ٹیلیفون بند کر دیا، سگار سلگایا اور کمرہ میں ٹہلنے لگے، تھوڑی دیر میں اوشا ناگن کی طرح لہراتی، اور بل کھاتی آ گئی، مہاراجہ نے بڑے تپاک سے اسکا استقبال کیا، ہاتھ ملایا اور اسے لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

"فرمائیے کیا بات ہے؟" اوشا نے کہا

"تم سے ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کرنی ہے"۔

"فرمائیے"۔

"کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم تم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ساتھی بن سکیں؟"

اوشا دِنا الجائی، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مہاراجہ نے کچھ دیر انتظار کیا، پھر انہوں نے بڑی نرمی سے کہا۔

"میں تمہارا جواب چاہتا ہوں اوشا"۔

"یہ بڑا (مسکرا کر) ٹیڑھا سوال ہے"

"بہت سیدھا سا سوال ہے، ایسا ہی سیدھا سا جواب دیدو"

"کیا جواب دے دوں؟"

"منظور کرلو میری پیش کش"

"صرف میرا فیصلہ کافی نہیں ہے"

"پھر؟"

"پتاجی سے کہیے"۔

"انہیں میں راضی کرلوں گا"۔

"تو مجھے کوئی اعتراض نہیں"

یہ جواب سنکر مہاراجہ اتنے خوش ہوئے کہ

250/3, Bihar Colony, KARACHI

ع۔ جاں نظر دینی بھول گئے اضطراب میں!

ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں، وہ اسوقت سراپا مسرت و ابتہاج بنے ہوئے تھے، انہوں نے کہا

"اوشا تم نے میری بڑی مشکل آسان کر دی"

"لیکن میں کچھ پوچھوں آپ بتائیں گے؟"

"ضرور بتاؤں گا، پوچھو کیا پوچھتی ہو؟"

"کتنی رانیاں ہیں آپ کے پاس؟"

"اس سے تمہیں کیا؟"

"یہ سوال بھی بڑا اہم ہے"

"ہیں چار رانیاں پھر؟"

"پانچویں رانی بننے کا اعزاز مجھے حاصل ہوگا؟"

"یہی سمجھ لو، پھر؟"

"رانیوں کے اس ہجوم میں میری کیا پوزیشن ہوگی؟ یہ میں جاننا چاہتی ہوں"

"مہارانی کی پوزیشن ہوگی تمہاری"

"کب تک؟"

"جب تک میں زندہ ہوں"

"کیا یہی وعدے آپ نے دوسروں سے نہیں کئے تھے؟"

RAJA LIBRARY. Tannery Road, BIHAR COLONY, KARACHI.

"ہرگز نہیں"

"پھر مجھ میں کیا بات دیکھی کہ مجھے اتنا بڑا قول دے رہے ہیں،"

"دیکھو اوشا اصل بات یہ ہے کہ میری دوسری رانیاں تو ہیں لیکن وہ میری رفیق زندگی نہیں بن سکتیں، مجھے خوبصورتی نہیں چاہیئے، خاندان نہیں چاہیئے، خون نہیں چاہیئے، مجھے ایسی رفیقۂ حیات کی ضرورت ہے جو میرا بوجھ بٹا سکے، جو امور مملکت میں حقِ رفاقت ادا کرسکے، جو تعلیم یافتہ ہو، سوسائٹی کے آداب اور قوانین سے واقف ہو جسکی نظر وسیع ہو، علم پختہ ہو، یہ خصوصیات صرف تم ہی میں ہیں، دوسری رانیوں میں نہیں - ان سے میں نے شادی کی ضرورۃً مصلحتاً، خاندان کے سبب حالات کے ماتحت، تم سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں، دلی لگاؤ سے مجبور ہو کر، تمہارے گُن اور سبھاؤ کو دیکھ کر، تمہاری قابلیت اور اہلیت سے متاثر ہو کر . . . . سچ بتاؤ اوشا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس تقریر سے اوشا بہت متاثر ہوئی، اسے اس وقت مہاراجہ پر رحم آرہا تھا کہ کیسی صحبت ناجنس میں وہ گرفتار ہیں، دن بھر امور مملکت سے نپٹ کر جب وہ محل میں جاتے ہونگے، تو ذہنی و دماغی تفریح کا انہیں کوئی سامان نہیں ملتا ہو گا - بیچارے کڑھ کے رہ جاتے ہوں گے -

اوشا چلی گئی، اسکے جانے کے بعد مہاراجہ نے اپنی اسکیم مرتب کی،

کنور جسونت سنگھ پر ڈورے ڈلے، اُن کے لئے یہ سوال ثانوی حیثیت رکھتا تھا کہ مہاراجہ کے عادات و اطوار کیسے ہیں؛ ان کا اخلاق کیسا ہے؛ ان کی کتنی جائز اور ناجائز بیویاں ہیں، ان کے نزدیک اہم ترین سوال تھا، کہ اتنی بڑی ریاست کی مہارانی بننے کا شرف اُن کی بڑی صاحبزادی کو حاصل ہو رہا ہے، یہ اعزاز خود ان کے لئے بھی کم مایۂ افتخار نہیں تھا۔

مہاراجہ کو کنور صاحب کے راضی کرنے میں زیادہ دوڑ دھوپ اور دوا دوش نہیں کرنی پڑی، وہ آسانی سے راضی ہو گئے، صرف اُن کے راضی ہونے کی دیر تھی، دونوں طرف سے دھوم دھام کے ساتھ شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔

اس گفتگو کے پندرہ روز کے اندر اندر تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں، اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ کماری اوشا دیوی سورج پور کی مہارانی بن گئیں۔

اوشا کو پاکر مہاراجہ تو خیر وفور مسرت کے سبب شادی مرگ کے نازک دور سے گذر رہے تھے، لیکن خود اوشا بھی کم مسرور نہیں تھی، وہ بھی ایک اچھے اور بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، مہاراجہ نہ ملتے تو بھی اسے کوئی بڑا ہی آدمی حاصل کر سکتا تھا، لیکن مہاراجہ کی بات ہی اور تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ کنور صاحب کے خاندان کا ایک بڑی ریاست سے رشتہ

ہوا، کنور صاحب کا جہاں تک تعلق تھا، وہ بھی بے انتہا خوش و خرم نظر آ رہے تھے،

کچھ دنوں کے بعد مہاراجہ صاحب نے اوشا سے سورج پور چلنے کا تقاضا کیا وہ خود وہاں جانے کے دن گن رہی تھی، اس کے تمام اصلاحی اور تعمیری پروگرام اسی دن کے انتظار میں ملتوی ہو رہے تھے، جب وہ سورج پور جائے گی، اور وہاں اپنے نئے منصب سے فائدہ اٹھا کر عورتوں کی ترقی اور رعایا کی اصلاح کا کام پوری تن دہی اور جانفشانی سے شروع کرے گی۔

اس نے اپنی بعض اصلاحی اور تعمیری تجویزوں کا ذکر، مہاراجہ سے کیا۔ انہوں نے نہایت مسرت کے ساتھ اسے پوری پوری آزادی عطا فرما دی کہ وہ جو چاہے کرے، اور مہاراجہ سے پرزور تائید کے سوا کسی قسم کا اندیشہ اپنے دل میں نہ لائے۔

سورج پور پہنچنے کے بعد مہاراجہ نے نئی شادی کی تقریب میں ایک دھوم دھامی دربار منعقد کیا، اس موقع پر سب سے پہلے اوشا کے فضائل و کمالات سے انہوں نے حاضرین باتمکین کو روشناس کرایا، پھر اوشا نے ایک پرزور تقریر میں اپنے مخلصانہ عزائم کا اظہار کیا، جن پر عام طور پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا،

اس موقع پر بعض اخبارات کے نمائندے بھی آئے تھے، اور متعدد شعرائے کرام

نے بھی شرکت کی زحمت گوارا فرمائی تھی۔ اخبارات کے نمائندوں اور شاعروں کی بھی اچھی خاصی آؤ بھگت ہوئی، ان اخبارات نے مہاراجہ کے عدل وانصاف اور اوشا کی اہلیت و صلاحیت کو بڑے نمایاں طریقے سے اپنے کالموں میں شائع کیا، پرائیویٹ سکریٹری صاحب کی طرف سے ان اخبارات کو شکریہ کا خط بھی لکھا گیا۔

مہاراجہ اور اوشا کی زندگی قابلِ رشک طریق پر بسر ہو رہی تھی، اوشا مہاراجہ کے التفات فراواں کی شکر گذار تھی اور مہاراجہ اوشا کے حسن اخلاق اور حسن سیرت کے مداح تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا، اب سے پہلے دونوں کی زندگی میں ایک خلا تھا، جو اس رشتہ اور تعلق کے بعد خود بخود دور ہو گیا۔

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
...HAR COLONY, KARACHI.

باب
(۱۷)
راجکماری شیلا

کبھی کبھی پھول بھی کانٹا بن جاتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ محبوب معتوب ہو جاتا ہے، دوست کو ہم دشمن سمجھنے لگتے ہیں، کچھ ایسا ہی معاملہ اوشا اور مہاراجہ کے درمیان ہوا۔

دونوں کی زندگی عیش و مسرت سے گذر رہی تھی، اوشا ہر فکر سے بے نیاز، مہاراجہ صرف اسی کے ہو رہے تھے، ایک روز کنور جسونت سنگھ کا خط

اوشا کو ملا، لکھا تھا، راجکماری لندن سے واپس آگئی ہے تمہیں بہت
کرتی ہے، جب سے آئی ہے تمہارا ہی ذکر کرتی رہتی ہے اپنے ساتھ کچھ بیمار
بھی لائی ہے، کمزور ہمیشہ کی ہے اسلئے ڈر لگتا ہے کہیں یہی معمولی شکایتیں
نازک صورت نہ اختیار کرلیں، اگر کچھ دنوں کے لئے تم آجاؤ تو بڑا اچھا ہو، وہ
سے بہت مانوس ہے تمہیں دیکھتے ہی اسکی آدھی بیماری چلی جائے گی، ہمیشہ
تم ہی اسکی دیکھ بھال کرتی آئی ہو، مجھے تو وہ بے وقوف بنادیتی ہے لیکن
اسے دوا بھی خوب پلا سکو گی، اگر کہنا مانتی ہے تو بس تمہارا، میری تو وہ سن
ہی نہیں، بڑی احسان فراموش ہے تمہاری راجکماری، دیکھو تو میں اس کا
باپ بھی ہوں اور ماں بھی، جب سے تمہاری ماں مری ہے سچ کہتا ہوں تم دو
کی ماں نہیں بن گیا ہوں، لیکن اس چھوکری کو دیکھو مجھے کچھ سمجھتی نہیں، میرا بھی تم
دیکھنے کو بہت جی چاہ رہا ہے، آجاؤ تو مجھ پر بھی احسان کروگی۔

یہ خط پڑھ کر اوشا بہت متاثر ہوئی، وہ راجکماری سے صرف تین بر
بڑی تھی، لیکن ماں کی طرح اسے چاہتی تھی، راجکماری کا اصل نام شیلا تھا، اسی
اسے پیار سے "راجکماری" کہنا شروع کیا تھا، اور رفتہ رفتہ یہی اس کا نا
پڑ گیا۔

شیلا بڑی شوخ اور الھڑ لڑکی تھی، شرارت تو اسکی گھٹی میں پڑی ہوئی
لیکن اوشا کا مان وہ بہت رکھتی تھی، وہ واقعی اسے اپنی ماں سمجھتی تھی

تعلیم کے لئے وہ لندن گئی تھی، اب تین چار سال بعد تاریخ میں پی، ایچ ڈی
کی ڈگری لے کر واپس آئی تھی، اوشا اسکی عدم موجودگی میں سورج پور کی مہارانی
بنی تھی، فوراً اوشا نے مہاراجہ صاحب سے مشورہ کیا، طے یہ پایا بجائے اس کے
کہ اوشا جائے، شیلا یہیں بلالی جائے۔

دوسرے روز اوشا نے کنور صاحب کو خط لکھ دیا کہ میں آپ کا خط
پڑھتے ہی حاضر ہوتی لیکن یہاں کچھ کام میں نے ایسے چھیڑ رکھے ہیں کہ ہل بھی
نہیں سکتی، میرے یہاں سے ہٹتے ہی وہ درہم برہم ہو جائیں گے، میری اور مہاراجہ
کی تمنا یہ ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لئے راجکماری کو یہاں بھیجدیں، میری آنکھیں
اسکے دیکھنے کو ترس رہی ہیں، جب تک وہ یہاں نہ آجائے گی، مجھے کل نہیں
پڑے گا، میرے پتاجی، میری یہ درخواست منظور کر لیجئے اور اور فوراً
راجکماری کو روانہ کر دیجئے، یہاں آتے ہی اسکی طبیعت بھی بہل جائے گی،
اور میرے کاموں میں وہ میرا ہاتھ بھی بٹائے گی، اور اگر علاج کی ضرورت ہوئی
تو اس کا علاج بھی اچھی طرح سے ہو جائے گا۔

کنور صاحب تو اب بھی شیلا کو سورج پور بھیجنے میں تامل کر رہے تھے،
لیکن خود شیلا نے وہ طوفان اٹھایا کہ آخر کنور صاحب کو مانتے ہی بنی۔
شیلا سورج پور پہنچی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی، اوشا پروانہ وار اسپر
صدقے قربان ہوتی تھی، مہاراجہ صاحب بھی اس کی بہت خاطر مدارات کرتے

تھے، اس کے آنے سے ایک نئی رونق آگئی تھی، بڑی چہل پہل رہتی تھی ہر وقت محل میں، اسکی یہ عادت تھی کہ وہ جلد بے تکلف ہوجاتی تھی ہر کسی سے اپنے تئیں کھنچے رہنا، رکھ رکھاؤ سے رہنا، رعب اور وقار کا مظاہرہ کرنا، تو شیلا کو آتا ہی نہ تھا، وہ سب سے یکساں بے تکلفی کے ساتھ ملتی تھی، خواہ وہ مہاراجہ ہوں یا مہارانی، اوشا اس کی مزاج شناس تھی، اسلئے وہ روک ٹوک بھی نہیں کرتی تھی۔

ایک مرتبہ اوشا اور شیلا میں ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں، مہاراج بھی ناخواندہ مہمان کی طرح پہنچ گئے، شیلا نے کہا۔

"آگئے آپ؟"

"ناگوار ہو تو چلا جاؤں؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی ناگوار کیوں ہوگا آپ کا آنا؟"

میں نے کہا شاید"

"ہاں یہ تو بتائیے"

"کیا بتاؤں؟"

"آپ کوئی اور شادی کرنے والے ہیں؟"

"یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟"

"میں نے کہا پانچ مہارانیاں تو ہیں ایک کا اور اضافہ ہوجائے

تو آدھے درجن تک تعداد پہنچ جائے۔" یہ کہکر شیلا زور سے ہنسی، اوشا نے بھی اس کا ساتھ دیا، مہاراجہ نے صرف زیر لب تبسم پر قناعت کی،

اسی طرح مجلسیں جمتی تھیں اور قہقہوں پر ختم ہو جاتی تھیں، اوشا اپنی جگہ خوش، شیلا الگ نہال، مہاراجہ جدا مسرور، غرض ہر فکر سے یہ چھوٹا سا خاندان آزاد تھا،

چار مہینہ کی مدت گذر گئی، اس اثناء میں کسی کو احساس بھی نہیں ہوا کہ تعلقات کا دھارا کس طرف بہ رہا ہے؟ البتہ ایک بات قابلِ توجہ ضرور تھی۔ مہاراجہ اگرچہ ویسے ہی ہشاش بشاش اور خوش و خرم تھے، لیکن اب وہ ذرا کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، کچھ سوچا کرتے تھے، باتیں کرتے کرتے اور باتیں سنتے سنتے کہیں سے کہیں، نہ معلوم کہاں پہنچ جاتے تھے، شیلا اس "انداز جنوں" کا مذاق اڑاتی، اوشا کو مخاطب کر کے کہتی تھی، لو مہاراجہ صاحب یہاں سے جانے کہاں چلے گئے، ان کی خبر لو دیدی، یہ اب ہاتھ سے نکلنے والے ہیں، مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ اوشا ان کی اس حالت سے وقتی طور پر کچھ دلگیر اور افسردہ سی ہو جاتی تھی لیکن مہاراجہ کے بحال ہوتے ہی وہ پھر سب کچھ بھول جاتی تھی، پھر اسکی باتوں میں وہی رعنائی اور جوانی چھلکنے لگتی تھی، خود مہاراجہ بھی اپنے اس حالِ دروں کو اگرچہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے، لیکن صاف معلوم ہوتا تھا دل پر کچھ کیفیت سی گذر رہی

ہے اور وہ اُسے چھپانا چاہتے ہیں، کوئی ٹٹولے تو ٹالنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔

شیلا ٹینس کا ایک میچ دیکھنے گئی ہوئی تھی، اوشا چپ چاپ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی، اتنے میں مہاراجہ آئے، اوشا لیٹی ہوئی تھی، اُٹھ کر بیٹھ گئی، مہاراجہ صاحب بھی بیٹھ گئے، کہنے لگے۔

"شیلا کہاں ہے؟"

"میچ دیکھنے گئی ہے وہ!"

"اوشا میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے"

"سنوگی؟"

"ضرور"

"مانوگی؟"

"میرا فرض ہے یہ"

"خفا تو نہ ہوگی"

"وہ ایسی کیا بات ہے جس کے لئے آپ پہلے سے عہد نامہ منظور کرا رہے ہیں؟"

"(مسکرا کر) ہے کچھ ایسی ہی بات"

"تو کہہ ڈالوں؟"

"ضرور ضرور"

"میری باتیں سُنکر تم نہ جانے مجھے کیا سمجھنے لگو۔"

"میں آپ کو بُرا نہیں سمجھ سکتی۔"

"دیکھو بات یہ ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں کہیئے کیا بات ہے؟"

"اِنسان دِل کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔"

"یہ میں بھی جانتی ہوں"

"یہی میرے بارے میں سمجھو"

"کیا بات ہوئی کچھ کہیئے تو"

"تم سے نہ کہوں گا تو کس سے کہوں گا۔"

"اسی لئے تو میں سُننا چاہتی ہوں"

"شیلا کی شادی کے بارے میں تم نے کچھ سوچا؟"

"یہ کام پتا جی اور خود شیلا کا ہے، میں دخل نہیں دینا چاہتی، کیا آپ کی نظر میں کوئی اچھا اور برابر کا آدمی ہے؟

"ہاں ہے"

"کون ہے وہ؟"

"اگر تم لوگ منظور کر لو تو بتا دوں اس کا نام؟"

"آخری منظوری تو شیلا کے ہاتھ میں ہے، لیکن اگر اچھا آدمی ہو گا تو ضرور میں شیلا پر زور دوں گی۔"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا آدمی اچھا ہے یا بُرا؛ لیکن یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تم اس کی اچھائی کی قائل ہو، اُسے مانتی ہو، اسکی تعریف کرتی ہو"

"بتلائیے نا اس کا نام؟"

"بتا ہی دوں؟"

"ہاں ہاں انتظار کا ہے کا ہے؟"

"وہ شخص میں ہوں"

"آپ شیلا سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں میں!"

"آپ میری بہن کو اپنی بیوی بنانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں! ہمارا فلسفہ جب اس سے ہمیں نہیں روکتا، تو ہماری سماج اس سے کیوں روکے ہمیں؟"

"میری وفاداری کا یہی انعام ہے"؟

"تم اسے انعام بھی کہہ سکتی ہو، اور سزا تو بہرحال یہ نہیں ہے۔"

"میں اسے سزا بھی سمجھتی ہوں اور توہین بھی"!

"یہ تمہارا خیال ہے!"

"اور میں سمجھتی ہوں کہ بہت صحیح ہے خیال میرا!"

"تو تم میری کوئی مدد اس معاملہ میں نہیں کرو گی؟"

"ہرگز نہیں"

"اتنی سنگدل ہو تم؟"

"سنگدل آپ ہیں یا میں؟"

"مجھے تم سے بڑی امید تھی"۔

"میں پاپ کی ساتھی نہیں ہوں"

"میں پاپ کب کرنا چاہتا ہوں"

"تو یہ پن ہے؟"

"میں کوئی ناجائز آرزو نہیں رکھتا، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، اسے اپنی بیوی بنا کر رکھنا چاہتا ہوں" "اسے اپنی رانی بنانا چاہتا ہوں"۔

"آدھے درجن کی تعداد پوری کرنے کے لئے؟"

"تمہیں میرا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں ہے"۔

"آپ کو میری توہین کرنے کا حق ہے، مجھے زندہ درگور کرنے کا حق ہے، میرے ارمانوں کو کچلنے، میری تمناؤں کو روندنے، اور میری آرزوؤں کو پامال کرنے کا حق ہے، لیکن مجھے آپ کا مذاق اڑانے کا حق بھی نہیں ہے"

JA LIBRARY.
nnery Road,
Colony
OLONY, KARACHI.

"عجیب بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو تم"

"یہی سہی"

"آج تم نے مجھے بڑا صدمہ پہنچایا"

"اور آپ نے مجھے باغ باغ کر دیا"

"تم کہہ چکی ہو آخری فیصلہ شیلا کے ہاتھ میں ہے"۔

"یقیناً"

"میں کیوں نہ اسی سے معاملہ طے کروں؟"

"آپ اگر اس کا دل بھی دکھانا چاہتے ہیں، تو ضرور اپنی یہ حسرت نکال لیجئے آپ!"

"وہ تمہاری طرح بے وقوف نہیں ہے، اس کا رویہ یقیناً دوسرا ہوگا"

"تو میں کب منع کرتی ہوں، اس سے بھی آپ پوچھ دیکھئے"۔

اتنے میں شیلا آتی ہوئی دکھائی دی، اسے دیکھتے ہی اوشا اٹھی اور بغلی کمرہ میں چلی گئی، شیلا آئی اس نے مہاراجہ سے پوچھا،

"دیدی کہاں ہیں؟"

"اس کمرہ میں . . . . لیکن تم بیٹھو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے!"

"(بیٹھ کر) کہئے"

"تمہاری دیدی بے وقوف ہیں"۔

"خوب پہچانا آپ نے، کیوں نہ ہو
"ولی را ولی می شناسد!"

یہ کہہ کر وہ حسبِ معمول ہنسی،

مہاراجہ نے کہا،

"شیلا تمہاری دیدی خفا ہو گئیں"

"کیوں؟"

"ذرا سی بات پر"

"آپ بہت ستاتے رہتے ہیں انہیں"۔

"میں نے تو ایک سیدھی سی بات کہی تھی وہ بگڑ بیٹھیں"

"کیا بات کہی تھی آپ نے؟"

"کچھ تمہارے بارے میں"

"میرے بارے میں؟"

"ہاں"

"ذرا بتائیے تو"

"تمہاری شادی کا سوال تھا"

"تو اسے آپ لوگ طے کرنے والے کون؟"

"میں نے تو ایک تجویز پیش کی تھی"

"کیا تھی وہ تجویز"

"میں چاہتا ہوں کہ تم یہیں رہو"

"یعنی شادی نہ کروں؟"

"ضرور کرو"

"پھر یہاں کیسے رہوں؟"

"کیا تمہاری شادی مجھ سے نہیں ہو سکتی؟"

یہ سنتے ہی شیلاؔ کا چہرہ بھبوکا بن گیا، اس نے بڑی حقارت کے ساتھ

"بڑے بے شرم ہیں آپ"

کہا، اور اوشا کے کمرہ میں چلی گئی، جاتے ہی اوشاؔ کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اوشاؔ سمجھ گئی وہ کیوں رو رہی ہے، اس نے اس سے کچھ پوچھ گچھ نہیں کی اور خود بھی اسکے ساتھ رونے لگی۔

رونے سے دونوں کا دل ہلکا ہو گیا، شیلاؔ نے کہا، اب میں یہاں ایک منٹ نہیں ٹھیر سکتی، پہلی ٹرین سے واپس جاتی ہوں اور پتا جی سے سارا ماجرا کہتی ہوں، یہ حضرت اپنے تئیں سمجھتے کیا ہیں؟ پتا جی بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں، ناکوں چنے نہ چبوا دیں جب کی بات، ذرا جیوٹ تو دیکھو اس مورکھ کا، چھوٹی بہن کو بڑی بہن کی سوکن بنانا چاہتا ہے۔

اوشا نے اس رائے سے تو اتفاق کیا کہ شیلاؔ فوراً سورج پور سے چلی

جاتے، لیکن یہ تاکید بھی کی کہ پتا جی سے اس ناپاک بات کا ذکر نہ آئے شیلا اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی کہ پتا جی سے سب کچھ کہوں گی، اور اوشا اپنی نصیحت کا دفتر کھولے ہوئے تھی کہ اس بات کا ذکر نہ آئے، تمہارے یہاں سے جاتے ہی یہ بات بھی ختم ہو جائے گی، پھر اس کے اٹھانے سے فائدہ کیا۔

اوشا نے ٹیلیفون پر مہاراجہ کو اطلاع دی کہ شیلا واپس جا رہی ہے مہاراجہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ ٹیلی فون بند کر دیا۔

بہرحال شیلا چلی گئی، کنور صاحب نے اس سے سورج پور کے حالات دریافت کئے، اس نے بے چون و چرا ساری تفصیل بتا دی، سنتے ہی کنور صاحب کا چہرہ وفور غضب سے تمتما اٹھا، مہاراجہ صاحب اُن کے سامنے ہوتے تو اسی وقت فیصلہ ہو جاتا اور دونوں سے کوئی ایک اس دنیائے دنی کو خیرباد کہہ چکا ہوتا۔

دوسرے روز کنور صاحب نے دو خط لکھے ایک اوشا کو دوسرا مہاراجہ صاحب کو، دونوں خطوں کا خلاصہ یہ تھا کہ کچھ روز کے لئے کنور صاحب اوشا کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔

مہاراجہ صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن ایک ہفتہ کے بعد بغیر کسی پیشگی اطلاع کے اوشا آ گئی، کنور صاحب اسے دیکھتے ہی بچوں کی طرح رونے لگے، اوشا کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

سہ یہ کہدو ابر باراں سے اگر برسے تو یُوں برسے
کہ جیسے مینہ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

کنور صاحب نے بس چاؤ، اور آشا سے اُوشا کا ہاتھ مہاراجہ کے ہاتھ میں دیا تھا، اس کا انجام ایسا حسرتناک ہوگا، اس کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں تھا کنور صاحب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اُوشا کو سورج پور نہیں بھیجیں گے۔ خود اُوشا کا بھی قطعی فیصلہ تھا، مہاراجہ نے نہ اسکی خیریت پوچھی نہ اُسے بلایا، یہاں وہ رانی بنی ہوئی تھی، علاقہ کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا، گھر کی وہی ملکہ تھی، شیلا اس کی داسی بنی ہوئی تھی، کنور صاحب اس کے اشارہ پر ناچتے تھے، اُوشا کو جو صدمہ پہنچا ہے، اسکی کسی حد تک تلافی اسطرح ہو جائے کہ یہاں اس کا دل نہ دُکھے، یہاں اسکی کوئی بات کوئی ٹال نہ سکے، یہاں اسکی ہر خواہش اور آرزو پوری ہو، یہی وجہ تھی کہ وہ اُوشا کو ولی عہد بنائے ہوئے تھے، اور اس کا ذرا بھی دل میلا نہیں ہونے دیتے تھے۔

لیکن عورت کی زندگی سمٹ کر اسکے شوہر میں حل ہو جاتی ہے وہ دُنیا کا ہر غم سہ سکتی ہے لیکن یہ نہیں گوارا کر سکتی کہ اس کا شوہر اس کے علاوہ کسی اور کا ہو رہے، اور، اور بھی کون خود اسکی سگی چھوٹی بہن۔

آوشا باپ کے گھر بڑے آرام سے تھی، لیکن دل کا آرام یہاں بھی نہیں تھا، جب سے آئی تھی، چپ چپ رہتی تھی اشیلا لاکھ لطیفے سنائے، کنور صاحب ہزار اس کا دل بہلائیں، لیکن دل کی کلی مرجھا رہی تھی، اسکی شگفتگی کے واپس آنے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔

اب آوشا کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا، ڈاکٹروں کی رائے تھی یہ بخار خطرناک ہے، دِق کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہر طرح کی احتیاط کی گئی، ہر طرح کا علاج کیا گیا۔ اس کی بیماری پر کنور صاحب نے پانی کی طرح روپیہ بہایا لیکن ؎

کونسی کی نہ دوا کون سی مانگی نہ دعا
ہم نے کیا کیا نہ کیا تیرے سنبھلنے کیلئے

آوشا کی حالت سنبھلنے کے بجائے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔

آخر ڈاکٹروں نے فیصلہ کر دیا آوشا دِق کی مریض ہے، اور یہ مرض تیزی کے ساتھ ترقی کے مراحل طے کر چکا ہے، اب اسکی زندگی کی کوئی آس نہیں ہے، پھر بھی، جب تک سانس، تب تک آس، علاج آخر وقت تک ہوتا رہا، دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، پرہیز اور احتیاط میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔

آخر وہ وقت بھی آ گیا جس کا دھڑکا تھا، بہترین طبی امداد اور ہر

قسم کے آرام و آسائش کے باوجود اُوشا جانبر نہ ہو سکی، وہ ناکام و نامراد اِس دُنیا سے اُٹھ گئی، مہاراجہ صاحب نے اُوشا کی خبرِ وفات اس طرح سُنی گویا کوئی خلافِ توقع اور افسوسناک واقعہ ظہور میں نہیں آیا ہے ۔

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب
(۱۹)

بہارستان

مہاراجہ نے اپنے محل کے قریب ایک وسیع احاطہ میں ایک باغ تیار کرایا تھا جس کا نام "بہارستان" تھا، اسی باغ کے اندر انہوں نے ایک زندہ عجائب خانہ بھی قائم کیا تھا، طرح طرح کی چیزیں تھیں اس میں،

کسی طرف ہرن کلیلیں بھر رہے ہیں کسی جانب شیر گرج رہا ہے، کہیں ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے، کہیں کئی قسم کے بندر خوخیا رہے ہیں، چرند وپرند،

سب ہی قسم کے جانور تھے، پرندوں میں طوطے، کبوتر، مور، مرغ نہایت
اعلیٰ نسل کے موجود تھے، دریائی گھوڑے کا بھی ایک جوڑا تھا، تالاب میں طرح
طرح کی مچھلیاں تیر رہی تھیں، زہریلے جانوروں میں سانپ، بچھو، کھنکھجورے
کی مختلف قسمیں موجود تھیں،

مہاراجہ کو سب سے زیادہ دلچسپی سانپ سے تھی، خطرناک سے خطرناک
زہریلے سے زہریلے، خوبصورت سے خوبصورت سانپ مہاراجہ کے
عجائب گھر میں موجود تھے، ان سانپوں کے دانت تڑوا دیئے جاتے تھے،
اسلئے یہ خواہ کیسے ہی خطرناک اور زہریلے ہوں مگر سر پٹک کے رہ جاتے
تھے، جن سانپوں کو دیکھ کر آدمی کا پتہ پانی ہو جائے وہ یہاں آکر اتنے بے بس
ہو جاتے تھے کہ گھنٹوں ان سے شغل کیجئے، کیا مجال جو کچھ گزند پہنچا سکیں
مہاراجہ صاحب، سانپ کو ہاتھ میں لے کر فرمایا کرتے تھے، کتنا خوبصورت
جانور ہوتا ہے یہ،

سانپ کے بعد مہاراجہ کو موروں سے دلچسپی تھی، رنگ رنگ کے
مور ان کے بہارستان میں اپنی بہار دکھا رہے تھے، "رقص طاؤس" کے
وہ بڑے مداح تھے، جب اپنے پروں کو پھیلا کر مور ناچتا تھا، مہاراجہ
بہت محظوظ ہوتے تھے، انہوں نے بصرف کثیر نہایت ہی اعلیٰ نسل کے
سانپ اور مور جمع کر رکھے تھے، ان کی نگہداشت کا کام وہ بہ نفس نفیس

انجام دیتے تھے، کسی مور کی طبیعت خراب ہوئی، کسی سانپ پر افسردگی طاری ہوئی، مہاراجہ بیقرار ہو گئے، ہر حیثیت پر قدرت کے ان شاہکاروں کو وہ تندرست اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے تھے،

پہلے زمانہ کے بادشاہ اپنی سنگدلانہ دلچسپیوں کے لئے بدنام ہیں ہاتھیوں کی لڑائیاں، شیر اور ہاتھی کی جنگ، ایک کٹہرہ کے اندر شیر اور انسان کی لڑائی، یہ اُن کے پسندیدہ اور محبوب مشاغل تھے، مہاراجہ ان لڑائیوں کو پسند نہیں فرماتے تھے، لیکن سانپ اور مور کی جنگ بڑے شوق سے دیکھتے تھے، سانپ، اور نیولے کی لڑائی ان کا مرغوب مشغلہ تھا،

جس طرح پہلوانوں کی کشتیاں ہوتی ہیں، بڑے بڑے مشہور پٹھے میدان جنگ میں آتارے جاتے ہیں اور وہ اپنے زور بازو، اپنے کرتب اور اپنی صناعی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اسی طرح مہاراجہ سانپ اور مور کو تربیت دے کر، سانپ اور نیولے کی "ریہرسل" کرا کے میدان میں اتارتے تھے اور ان کی خون آشام جنگ کا ملاحظہ فرماتے تھے، جسطرح گاما اور امام بخش کی کشتیوں پر تماشائی کرسیوں سے اچھل اچھل کر ان کے فن کی داد دیتے ہیں، اسی طرح، مہاراجہ، مور کے داؤں اور سانپ کی حکمت عملی نیولے کی گھات، اور سانپ کی "شاندار پسپائی" پر وفور مسرت سے بے قابو

ہو ہو جاتے تھے، اور ان کی دیکھا دیکھی، حاضرین بانکین یعنی مصاحبان والاشان بھی شور مسرت سے جنگ آزماؤں کا اور مہاراجہ کا دل بڑھاتے تھے۔

خواہ کیسا ہی خطرناک سانپ ہو ہارنا ہمیشہ وہی تھا، جیت ہمیشہ نیولے یا مور ہی کی ہوتی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی، ان سانپوں کو جن کے خریدنے میں ہزاروں روپے مہاراجہ نے صرف کر دیئے تھے، لقمۂ اجل بننے کے لئے مور اور نیولے سے بھڑا دیتے تھے، محبوبوں کی جنگ باہمی بھی دلچسپ ہوتی ہے، مہاراجہ اپنے ان محبوبوں کو لڑتے ہوئے دیکھتے تھے، اور بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کی نگاہ کے سامنے سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے تھے، ان ٹکڑوں کا قیمہ بنتا تھا اور یہ قیمہ دائیں فاتح کے پیٹ میں پہنچ جاتا تھا، مگر مہاراجہ کی تیوری پر بل نہیں آتا تھا، وہ کہتے تھے، "میدانِ جنگ میں اگر خون خرابہ نہیں ہوگا تو کیا پھولوں کی بارش ہوگی؟"

موروں کی بھی اچھی قیمت مہاراجہ دیتے تھے، لیکن عجائب خانہ کا سب سے زیادہ قیمتی عنصر سانپ ہی تھا۔ ایک ایک ہزار سے لے کر پانچ پانچ ہزار تک کے قیمتی سانپ موجود تھے، اسی قیمت کی رعایت سے مہاراجہ نے ان کے نام بھی رکھے تھے، مثلاً جس کی قیمت ایک ہزار ہے وہ ہے "ایک ہزاری" جس کی تین ہزار ہے اسے "سہ ہزاری"۔ جس کی پانچ

ہزار ہے اسے "پنج ہزاری" کے نام سے یاد فرماتے تھے،

سانپوں کی نگہداشت کے لئے اور دوسرے جانوروں کی رکھوالی کے لئے انہوں نے ایک بہت بڑا عملہ رکھ چھوڑا تھا جس کا کام ہی یہ تھا کہ ان گراں مایہ مہمانوں کی خاطر مدارات، اُن کی دیکھ بھال، اُن کی دوا علاج اور تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ اگر عملہ کے کسی آدمی کے متعلق یہ معلوم ہوجائے کہ وہ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں غفلت کرتا ہے تو وہ اسے سنگین سزا دیتے تھے، وہ غبن کے مجرم کو معاف کر سکتے تھے۔ وہ اخلاقی مجرموں پر رحم و کرم کی بارش کر سکتے تھے سوا ایسے جنہے اُن کے مرغوب جانوروں کے ساتھ بدسلوکی کی ہو یا انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع دیا ہو۔

بعض بڑے پرانے سانپ تھے۔ سو سو اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو برس کی عمر کے، اُن کی بڑی قدر کی جاتی تھی، اور انہیں بادسموم سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی تھی، انہیں تقاضائے عمر کے پیشِ نظر میدانِ جنگ میں کودنے کی دعوت نہیں دی جاتی تھی، لڑنا جوانوں کا کام ہے، بوڑھے کیا جانیں لڑنا؛ ان کہن سال سانپوں میں سے جب کوئی اس عالمِ خاکی سے عالمِ جاوداں کی طرف رحلت فرماتا تھا، تو اسے پھینک نہیں دیا جاتا تھا، بلکہ سب سے پہلے تو اس پر "کارونر کی جیوری" بیٹھتی تھی، جو خدام اور طبی مشیروں کا بیان لے کر سببِ موت کا اعلان کرتی تھی، پھر باقاعدہ

اس کا جنازہ اُٹھایا جاتا تھا، پھر اسے ایک مختصر سی شمشان بھومی (قبرستان) میں لیجاکر صندل کی لکڑیوں کی کھپاچیوں سے ڈھانکا جاتا تھا، ان کھپاچیوں پر خالص گھی کے چند قطرے ڈالے جاتے تھے، اور مہاراجہ اُس آنجہانی کے واحد وارث کی حیثیت سے، دیا سلائی کی ڈبیہ لے کر ماچس سلگاتے تھے اور اُسے نظرِ آتش کر دیتے تھے، پھر اسکی خاک ایک ڈبیہ میں رکھ کر دفن کر دی جاتی تھی، ایک ایک بالشت کی متعدد سنگ مرمر کی قبریں بہارستان میں موجود تھیں، یہ انہیں سانپوں کی تھیں جو اس دُنیا کی سختیوں کی تاب نہ لاکر اس دُنیا میں پہنچ گئے، جہاں سختی اور تکلیف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، بعض بعض قبروں پر دو دو انگل کے سنگی تعویذ بھی لگے ہوئے تھے جن پر متوفی کا نام اسکی عمر، مرض الموت اور خاندان کی مختصر تفصیل درج ہوتی تھی، یہ امتیازی سلوک صرف سانپوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ دوسرے جانور اس عزّت افزائی سے محروم تھے۔

بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں، کچھ عرصہ کے بعد مہاراجہ کی طبیعت سانپوں سے سیر ہو گئی۔ اس جنس کی خریداری کا سلسلہ یک قلم موقوف ہو گیا جو باقی تھے وہ کس مپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، رفتہ رفتہ یہ گروہ ختم ہو گیا اس بے بسی اور بیچارگی کے عالم میں کہ اُس کے ذکر سے تکلیف ہوتی تھی اب جو سانپ مرتے تھے، اوّل تو اُن کی خبر وفات مہاراجہ کو پہنچائی

نہیں جاتی تھی، اور اگر کہیں سے انہیں کسی قیمتی سانپ کے انتقال پر ملال
ی سن گن مل گئی، تو بھی وہ کسی قلق یا اضطراب کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ
ور سے واقعہ کی تفصیل سُنتے بھی نہیں تھے۔

اب مہاراجہ کو ہاتھیوں سے دلچسپی ہو رہی تھی، تھوڑے ہی عرصہ
ں بھانت بھانت کے ہاتھی بہارستان کی زینت بن گئے آکر، چھوٹے
ڑے، موٹے، دُبلے، لمبے ٹھگنے، جنگجو یا امن پسند، باغی یا اطاعت شعار
رش یا نیاز مند کی تخصیص نہیں تھی، ہاتھی ہونا چاہیئے اُسے ہر قیمت
خرید لیا جائے گا۔ تھوڑے دنوں میں ہاتھیوں کی وہ کثرت اور وہ
ل پیل ہو گئی کہ اگر مہاراجہ اپنی فوج کو برخاست کر دیتے، اپنی پولیس
برطرف کر دیتے، اور ساری رعایا بغاوت پر آمادہ ہو جاتی، تو ان فیلان
زنجیر کی مدد سے مہاراجہ باغیوں کا قلع قمع کر سکتے تھے اور اپنی ریاست
ں امن و امان بحال کر سکتے تھے۔

اسی اہتمام کے ساتھ جو پہلے سانپوں کے لئے مخصوص تھا، اب ہاتھیوں
لئے، ایک بڑا عملہ "ایک ہیلتھ آفیسر" کی زیر سرکردگی رکھا گیا، ڈبل
وں کے ٹوکرے کے ٹوکرے، گنّوں کے کھیت کے کھیت یہ ہاتھی
ٹ کر جاتے تھے مگر کیا مجال جو مہاراجہ کے ماتھے پر شکن آجائے
ی خوشی سے۔ بہارستان کا یہ بڑھا ہوا بجٹ بیک اشارہ سر

منظور فرما لیتے تھے۔

ہاتھی بڑا سمجھدار جانور ہوتا ہے، تربیت بھی جلد حاصل کر لیتا ہے، حلیم اور بردبار بھی ہوتا ہے، اپنے آقا اور اپنے مہاوت کو خوب پہچانتا ہے اور اُن کا خاصا ادب و احترام بھی کرتا ہے، ہاتھیوں کی یہ ادا مہاراجہ کو بہت پسند تھی۔ جب ہاتھیوں کا پورے کا پورا مہاراجہ کی سلامی اتارتا تھا یا جب وہ اپنے دست مبارک سے نان پاؤ کا یا گنے کا ٹکڑا پیش فرماتے تھے اور وہ اگلے دونوں پاؤں ٹیک کر، ادب و احترام کے پورے مظاہرے کے ساتھ انہیں قبول کرتے تھے، تو مہاراجہ بہت مسرور ہوتے تھے، انہیں ہاتھیوں کی یہ ادا بہت بھاتی تھی۔

ہاتھیوں کی خونخوار لڑائی تو مہاراجہ نے کبھی نہیں کرائی، یہ دوسری بات تھی کہ کبھی کبھی بغیر کسی تحریص و ترغیب کے وہ ہو جایا کرتی تھی، مگر نقلی لڑائیاں اکثر مہاراجہ کی سرپرستی میں ہاتھیوں کی ہوا کرتی تھیں، اور یہ بھی خاصی دلچسپ ہوتی تھیں، وہ خود بھی اُن سے لطف اندوز ہوتے تھے اور اپنے مخصوص دوستوں کو بھی بلا کر اس دعوت سے لطف اندوز فرمایا کرتے تھے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ نقلی لڑائی اصلی بن جاتی تھی، اس صورت میں، ہوس تماشا اور زیادہ کامیاب ہوتی تھی لطف محلس کچھ اور بڑھ جاتا تھا، نبرد آزما ہاتھیوں کا چنگھاڑنا، پھر بپھر کر ایک

29-3-62

دوسرے پر پوری بے رحمی اور شقاوت کے ساتھ حملہ کرنا، سونڈ سے، سر سے، دانتوں سے حریف پر وار کرنا، لہو لہان ہوجانا، مگر میدانِ جنگ میں ڈٹے رہنا، یہ سب مناظر بڑے لرزہ خیز ہوتے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپ بھی، اور مہاراجہ صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ کسی دلچسپی سے نہ دستبردار ہوتے تھے، نہ احتراز کرتے تھے۔

ان ہاتھیوں میں بعض صرف "کاشتکاری" کے لئے وقف تھے، یعنی ان کا کام صرف یہ تھا کہ کھائیں پئیں اور اپنی نسل بڑھاتے رہیں، ان کی بڑی قدر و منزلت کی جاتی تھی، ویسی ہی قدر و منزلت جیسی بڑے گھرانوں میں داماد کی قدر و منزلت کی جاتی ہے، نو مولود ہاتھیوں کے لئے بھی خاص انتظامات تھے۔ زچہ کے لئے خاص طور پر مقوّی غذائیں تیار کرائی جاتی تھیں، اور اس کی بھی بڑی احتیاط کے ساتھ تیمار داری کی جاتی تھی۔

جو ہاتھی کسی سبب سے مرجاتے تھے ان کے آخری مراسم بھی بڑے دھوم سے اور تزک و احتشام سے ادا کئے جاتے تھے، پھر بڑی احتیاط سے انہیں دفن کیا جاتا تھا، اور پھر باقاعدہ اُن کی قبر تیار ہوتی تھی جس پر ایک گنبد بھی ہوتا تھا، ہاتھیوں کے نئے قبرستان کو بڑے اہتمام سے مہاراجہ نے سجایا تھا، بیل بوٹوں کے درمیان قبر بنائی جاتی تھی، اس کے درمیان میں کسی اچھے پھول کا پودا نصب کر دیا جاتا تھا تاکہ قبر میں

بھی مرنے والے کا مشامِ جان معطر رہے،

ان ہاتھیوں سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا، یہ صرف بہارستان کی زینت تھے، ان کی آبادی اور آبادی کے ساتھ مصارف بڑھ رہے تھے لیکن بڑے اور دریا دل لوگ آنہ پائی کا حساب کب کرتے ہیں ؛ یہ اُن کی توہین ہے!

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب
(۲۰)
اندھیرا

اس دُنیا میں کیا نہیں ہوتا، اس زمین کے اُوپر، اور اس آسمان کے نیچے انسان کیا کچھ نہیں کرتا؛ نشتر کی نوک، ایک معصوم کی زندگی بھی ختم کرسکتی ہے اور ایک پھوڑے کا درد بھی دُور کرسکتی ہے، تلوار سے دوست کی گردن بھی کاٹی جاسکتی ہے اور دشمن کا سر بھی اڑایا جاسکتا ہے، قوت، اقتدار، اور دولت کا مصرف یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ناتوانوں کی مدد کی جائے، مظلوموں کی دادرسی کی جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنکھیں بند کرکے شقاوت اور

سفاکی کے مظاہرے کئے جائیں، دِل کھولکر آدم کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ستایا جائے۔

مہاراجہ کے پاس اقتدار تھا، قوت تھی، دولت بھی اور ان سب کا استعمال خیر کے لئے کم اور شر کے لئے زیادہ کرتے تھے، ان سے بھلائیاں کم سرزد ہوتی تھیں، اور برائیوں پر وہ ادھار کھائے بیٹھے رہتے تھے۔ ٹوٹے ہوئے دِلوں کو جوڑنے میں، انہیں لطف نہیں آتا تھا، البتہ دِلوں کے توڑنے میں انہیں بڑا لطف آتا تھا، دلوں کے روندنے اور پامال کرنے کے فن سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔

مہاراجہ اب زندگی کی پینتالیس (۴۵) بہاریں دیکھ چکے تھے، بوڑھے تو وہ ابھی نہیں ہوئے تھے۔ لیکن بڑھاپا بڑی تیزی سے ان کا تعاقب کر رہا تھا، لیکن دِل ابھی تک جوان تھا، آرزوئیں ابھی تک زندہ تھیں، ارمانوں کی دُنیا میں ابھی تک تلاطم تھا، ہلچل تھی، طوفان تھا، جوانی دیوانی ہوتی ہے، جوانی کی دیوانگی ان پر بُری طرح مسلط تھی، اتنی زیادہ کہ وہ خود دیوانے بن گئے تھے۔

عنفوانِ شباب میں مہاراجہ کی شادی ایک پڑوسی ریاست کی راجکماری اندرا سے ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا کہ مہاراجہ صاحب صرف ولیعہد تھے، ابھی تک لذتِ حکومت سے آشنا نہیں ہوئے تھے، بڑے مزے میں گذر رہی تھی دونوں کی،

لیکن جب تخت حکومت پر مہاراجہ نے قبضہ کیا تو اندرا کو بھول گئے اب ان کی دلچسپیوں کی مرکز دوسری ہستیاں تھیں، اندرا سے انہیں کوئی لگاؤ باقی نہیں رہ گیا تھا۔

اندرا بڑی با اصول عورت تھی، اُس نے مہاراجہ کا رنگ رُخ دیکھا، اور اپنی ایک راہ عمل متعین کر لی، اُس نے یہ نہیں کیا کہ اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پڑ جاتی، رُوٹھ جاتی، رو رو کے آنکھیں سجا لیتی، فاقے کر کر کے اپنا وزن کم کر لیتی، کڑھ کڑھ کے دق کو دعوت دیتی، اور ایک دن نذر آتش ہو جاتی اُس نے کبھی مہاراجہ سے اُن کی بے رُخی کا شکوہ نہیں کیا، وہ

ع تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

کے اصول پر عامل تھی۔

گنگا دین، مہاراجہ کے محل کا انچارج تھا، بڑا کڑیل جوان تھا، بڑی بڑی آنکھیں گورا گورا رنگ، مضبوط و ورزشی جسم، اندرا نے اُسے دیکھا، مسکرا کر سر جھکا لیا، اُس نے اندرا کو دیکھا اور دیکھتا رہا، صرف ایک نظر نے پورا ایک عہد نامہ تیار کر لیا، آنکھوں آنکھوں میں دل کی باتیں ہوتیں، عشق کی گھاتیں ہوتیں، ہجر و فراق کی شکائیتیں ہوتیں، درد جدائی کے گلے شکوے ہوتے، اب صورت حال یہ تھی کہ اندرا اور گنگا دین، عشق کے ابتدائی مراحل طے کر چکے تھے، اور عملی مراحل کے میدان میں قدم رکھ رہے تھے، اندرا اپنے

شوہر کی امانت میں خیانت کر رہی تھی، گنگا دین اپنے آقا کی متاع پر ڈاکہ ڈال رہا تھا، دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ کار ثواب کر رہے ہیں، دونوں کا یہ خیال تھا کہ انہیں وہی کرنا چاہیئے جو وہ کر رہے ہیں۔ دونوں اس خیال میں مگن تھے کہ یہ زندگی چند روزہ ہے اسے رو رو کر کیوں کاٹا جائے ہنس بول کر اسے کیوں نہ گذار دیا جائے۔

اے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات
رو کر اسے گذار کہ ہنس کے گذار دے

اندرا نے رونے، کراہنے، جلنے، اور گھل گھل کر مرنے کا کام مہاراجہ کی آنے والی مہارانیوں کے لئے چھوڑ دیا تھا، ہنس ہنس کر زندگی بسر کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا تھا۔

جس طرح عشق چھپائے نہیں چھپتا، اسی طرح پاپ بھی پردہ چیر کر باہر نکل آتا ہے۔ یہی صورت گنگا دین اور اندرا کے ساتھ پیش آئی، ایک روز مہاراجہ نے دونوں کو حد سے تجاوز کرتے دیکھ لیا، اب نہ فرد قرار داد جرم عائد کرنے کی ضرورت تھی، نہ گواہان صفائی کے بیانات سننے کی، انہوں نے گنگا دین کو تو غبن کے الزام میں جیل بھیج دیا، اور اندرا کو اس کے باپ کے پاس

عطائے تو بہ لقائے تو

کہکر واپس کر دیا، اور پھر ایسے ایسے بھولے کہ بھول کر خبر بھی نہ لی، مہاراجہ

کے ملنے والوں میں، ریاست کے حکام میں، اُن سے قربت رکھنے والوں میں بہت کم ایسے لوگ تھے، جو یہ جانتے تھے کہ اندرا ابھی کبھی مہاراجہ کی بیوی تھی، وہ بھی کبھی انہی محلوں میں رہتی اور دادِ عیش دیتی تھی۔

اندرا کا وجود افسانۂ پارینہ بن گیا، مہاراجہ اُسے کیا بھولے ساری ریاست نے اُسے حرفِ غلط کی طرح فراموش کر دیا، مہاراجہ اس سے بالکل بے تعلق ہو چکے تھے۔

اندرا اپنی راجدھانی سے نکل کر اپنے باپ کی راجدھانی میں پہنچ گئی وہاں وہ مہارانی تھی یہاں وہ شہزادی تھی، نہ وہاں مغموم تھی نہ یہاں افسردہ تھی، تین مہینہ کے بعد وہ ایک خوبصورت بچی کی ماں بن گئی، مہاراجہ کو خوشخبری بھیجی گئی، اُنہوں نے فرمایا نہ اندرا میری بیوی ہے، نہ سوشیلا میری لڑکی ہے، مجھے دونوں سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ اعلان سُنکر، اندرا اور زیادہ مطمئن ہو گئی، وہ بھی یہ بھول گئی کہ مہاراجہ کبھی اسکے شوہر تھے وہ مہاراجہ کا نام بھی نہیں سُننا چاہتی تھی، جلسوں میں شرکت کرتی تھی، مرد اور عورت دوستوں سے خلا ملا بڑھاتی تھی، ٹینس بہت عمدہ کھیلتی تھی اپنے باپ کی ریاست میں تو وہ چمپین بن گئی تھی، ریاست کے حکام والامقام . . . . نوجوان اور خوب رُو . . . اس کی روشن خیالی کے گُن گاتے تھے، اسکی قابلیت کا لوہا مانتے تھے، اسے سوسائٹی کی جان

دیں؟ اب جینا ہی کتنے دن ہے؟، دونوں یہی سوچ رہے تھے، اسلئے بدستور اپنے راستہ پر گامزن تھے۔

جدائی کے کامل ۸ سال بعد... اندرا کے یتیم ہونے کی تقریب میں... بعض پرانے نمک خواروں نے مہاراجہ سے اندرا کے بارے میں رحم اور عفو کی التجا کی، مہاراجہ صاحب اسوقت نہ جانے کس دھن میں تھے کہ برہم ہونے کے بجائے، مسکرائے اور فرمایا، اگر وہ اپنی پچھلی غلطیوں کا اعتراف کرلے، اور اُن سے تائب ہوجائے، تو میں اسے پھر بلا سکتا ہوں تحریک شروع ہوئی، سمجھانے والوں نے اندرا کو بھی سمجھایا، اور خوش قسمتی سے وہ بھی سمجھ گئی۔ اب کیا تھا، جب سارے مراحل طے ہوگئے تو شرمسار اندرا مہاراجہ کے حضور میں پہنچ گئی، اب نہ جوانی کا وہ کیف تھا، نہ سرمستیوں کا وہ دور،

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے، بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

مہاراجہ اندرا پر بہت زیادہ التفات تو نہیں فرماتے تھے، لیکن اب وہ بے تعلقی اور بے رُخی بھی نہیں تھی جو تھی،

اندرا کے ساتھ سوشیلا بھی آئی تھی، اب وہ ۱۸ سال کی ایک گل اندام عورت تھی، شعر ذوقِ سلیم سے گراہوا سہی، لیکن اسکی کیفیت شباب کا

اور حریت تابی کی روح سمجھتے تھے، انہی حکام والا مقام کا ایک دوسرا طبقہ تھا۔۔۔۔ کہن سال جہاں دیدہ،۔۔۔۔ جو اندرا کے طور طریقوں کو ناپسند کرتا تھا، اسکی آزادروی سے بیزار تھا، لیکن اس سے ڈرتا تھا، اسلئے اسکی تعریف و توصیف میں پہلے گروہ سے بھی زیادہ پر جوش تھا، اندرا دوسرے طبقہ سے بے پرواہ تھی، اور پہلے طبقہ کی ڈرح بنی ہوئی تھی،

سورج پور میں تو پھر اس پر کچھ ذمہ داریاں تھیں، کچھ پاس لحاظ تھا، لیکن یہاں آکر تو وہ بالکل آزاد اور بے باک ہوگئی، اس کے رہنے کے لئے ایک پُر فضا مقام پر بنگلہ تھا، ٹھاٹھ سے وہاں اپنے اسٹاف کے ساتھ رہتی تھی، اور

خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است

کا مظہر اتم بنی ہوئی تھی۔

مہاراجہ کے تغافل اور اندرا کی خود فراموشی کو ایک مدّت گذر گئی، یہاں تک مہاراجہ نے عمر کی ۴۵ اور اندرا نے ۳۵ منزلیں طے کرلیں، دونوں شباب کی منزل سے پرے نکل گئے تھے، لیکن دونوں کا دل ابھی تک جوان تھا، ہوس اور بدراہی، اب تک دونوں کی رفیق زندگی تھی، شاید یہ دونوں اسے اپنی وضعداری کے خلاف سمجھتے تھے کہ اپنی روش میں کوئی تبدیلی کریں، کیوں تبدیلی کریں! ہمیں کیوں نہ اسے ہنستے کھیلتے یونہی گذار

مکمل نمونہ اس کے سوا کچھ اور ہو بھی نہیں سکتا،

اک ادا مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی
اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

وہ سراپا شعر و شباب بنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک ایک ادا شعر رنگین سے زیادہ پُر کیف تھی، اس کا ہر ہر غمزہ اور عشوہ، شراب ناب سے زیادہ نشہ آور تھا، اس کا وجود صبر و ضبط کے لئے، زہد و تقویٰ کے لئے، نیکی اور پارسائی کے لئے ایک چیلنج تھا، نہ رد کیا جا سکتا تھا نہ قبول

دو تین مہینہ کی مدت گذر گئی، کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، ایک روز مہاراجہ آئے، اندرا حسب معمول پیشوائی کے لئے بڑھی آج وہ کچھ برہم سے تھے، کہنے لگے،

"اندرا تم اب تک راہ راست پر نہیں آئیں"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی"

"تمہارے وہی کرتوت اب بھی ہیں جو پہلے تھے"

"کوئی ثبوت"، کوئی واقعہ؟

"ورجنوں"

"ایک آدھ کا ذکر تو فرمائیے"

"میں اگر ڈاکٹر کمار کا نام لوں تو؟"

"یہ آپ کا وہم ہے"

"مجھے تم سے عشق نہیں ہے کہ تمہارے بارے میں میں وہم کیا کروں"۔

"تو آپ مجھ سے پچھلی باتوں کا بدلہ لینا چاہتے ہیں اور بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں؟"

"تم کھری باتوں کو بے بنیاد کہتی ہو؟"

"آپ بے بنیاد باتوں کو کھری سمجھتے ہیں؟"

"بہر حال میں تمہارے اس چال چلن کو برداشت نہیں کر سکتا"۔

"تو آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"بتاؤں کیا چاہتا ہوں؟"

"ہاں بتائیے"

"تمہیں کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہوں"۔

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"یہ حسرت بھی پوری کر لیجئے"۔

"گنگا دین تمہیں یاد ہے؟"

"یاد ہے"

"وہ آج تک جیل میں سڑ رہا ہے"۔

"تو مجھے بھی بھیج دیجئے جیل"۔

"اتنی ہلکی سزا تم نے تجویز کی اپنے لئے؟"

"اچھا تو پھانسی دے دیجئے"۔

"یہ بھی معمولی سزا ہے"۔

"پھر آپ نے کیا سزا سوچی ہے؟"

"کان کھول کر سنو"،

"فرمایئے، سُن رہی ہوں"

"میں تمہاری جگہ سوشیلا کو دینا چاہتا ہوں"

"کیا مطلب؟"

"میں گنگا دین کی لڑکی سوشیلا کو اپنی ہوس رانیوں کا تختۂ مشق بنانا چاہتا ہوں"۔

"(کانپ کر) کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے پہلے کہہ دیا تھا کان کھول کر سنو"۔

"میرے کان مجھے (رو کر) دھوکہ دے رہے ہیں"۔

"ہرگز نہیں"

"جو کچھ میں نے سُنا وہ سچ ہے؟"

"بالکل سچ"

"آپ اپنی لڑکی کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں؟"

"وہ میری لڑکی کب ہے؟"

"پھر؟"

"یہ گنگا دین سے پوچھو۔"

"سوشیلا آپ کی لڑکی ہے"

"بالکل غلط"

"غلط سہی، گنگا دین کی سہی، لیکن کیا آپ اسے بھی نہیں مانتے کہ وہ میرے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے؟"

"مانتا ہوں اسے لیکن پھر؟"

"جو لڑکی آپ کی بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے اسے آپ اپنی ہوس رانی کا تختۂ مشق بنائیں گے"

"یقیناً"

"ہائے پرماتما یہ اندھیر!"

"یہ اندھیر نہیں ہے سزا ہے"

"لیکن سزا تو مجھے ملنی چاہیئے، آپ تو بے گناہ سوشیلا کو سزا دے رہے ہیں۔

"وہ بھی شریک جرم ہے، وہ اِن نتائج سے نہیں بچ سکتی جو تمہارے پاپ سے پیدا ہوتے ہیں"

"میں ہر سزا کی مستحق ہوں، میری بوٹی بوٹی چیل کووں کو کھلا دیجئے"

لیکن سوشیلا کو کچھ نہ کہیئے "

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

"آخر اُس نے کون سا گناہ کیا ہے آپ کا ؟"

"اُسے تمہارے گناہ کا حصّہ دار بننا پڑے گا"

"کیوں ؟ کیسے ؟ کس لئے ؟

"ماں باپ کے اعمال کا اثر اولاد پر بھی پڑتا ہے"

"کس طرح ؟"

"آتشک زدہ باپ کی اولاد آتشک سے نہیں بچ سکتی، یہ بیماری
ورثہ میں ملتی ہے"

"تو ؟"

"سوشیلا کو پاپ تم سے ورثہ میں ملا ہے"

"لہٰذا اسے سزا بھگتنی پڑے گی"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ؟"

"جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسکی تصدیق میرا عمل کر دے گا"

اب مہاراجہ کے چہرہ پر جلال شہر یاری برس رہا، انہوں نے تالی
بجائی، ایک درجن تنو مند اور مضبوط جوان مسلح حاضر ہوئے، ایک آدمی
کی طرف اشارہ کر کے مہاراجہ نے کہا، سوشیلا کو حاضر کرو، فوراً وہ

کی گئی، مہاراجہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "بیٹھو" وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی، لیکن حیران تھی کہ یہ ہو کیا رہا ہے؛ معاملہ کیا ہے؟ ہونے والا کیا ہے؛ یہ ماتاجی مجرم کی طرح سہمی ہوئی کیوں بیٹھی ہیں؛ یہ پتاجی شیر کی طرح کیوں گرج رہے ہیں؛ یہ سپاہی یہاں کیوں موجود ہیں؛ یہی باتیں وہ سوچ رہی تھی کہ مہاراجہ پھر گرجے، اُنہوں نے سوشیلا سے کہا۔

"تم میری لڑکی نہیں ہو"

"پھر کس کی لڑکی ہوں میں؟"

"گنگا دین کی"

"گنگا دین کون؟"

"یہ اپنی ماں سے پوچھو"

"آپ آج کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"بکواس مت کرو، سنو"

"کہیے"

"تمہیں میری داشتہ بنکر میرے پاس رہنا پڑے گا"

"مجھے؟"

"ہاں؟"

"آپ کے پاس؟"

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

"ہاں"

"آپ ایسی باتیں تو کبھی نہ کرتے تھے"

"آج کر رہا ہوں"

"آخر کس لئے ؟"

"اس لئے کہ تم خوبصورت ہو، تمہیں میرے پاس رہنا چاہیئے، مجھ سے بڑھ کر حسن کا قدر شناس کون ہوگا، میرے پاس ہوگی مزے کروگی"۔

"بھگوان میں مر کیوں نہیں جاتی"

"ابھی تمہیں زندہ رہنا ہے، اور تمہاری زندگی کی ہر طرح سے حفاظت کی جائے گی۔ تم اگر چاہو تو بھی نہیں مر سکتیں، اس وقت تک نہیں مر سکتیں، جب تک میرے دل سے نہ اتر جاؤ، جب تک میں تم سے نفرت نہ کرنے لگوں"

"آپ مجھ سے (رو کر) اب نفرت کیوں نہیں کرتے ؟ میں آپ کے دل سے اب کیوں نہیں اتر جاتی"۔

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے، یہ اس وقت ہوگا، جب میری مچلتی ہوئی آرزوئیں نکل جائیں گی، جب تم کو میں زینتِ آغوش بنالوں گا، جب تمہارے ہونٹ میری تشنہ لبی کو دور کردیں گے۔ جب تمہارے سینہ کی دھڑکن میرا دل سنے گا، جب میری سانس، تمہارے بدن میں گرمی پیدا کرے گی"۔

اس اثنا میں اندرا کا ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا، مہاراجہ نے

پھر تالی بجائی مسلح نوجوان اوٹ میں ہو گئے، وہ سوشیلا کی طرف اس طرح بڑھے جیسے بلی چوہے پر لپکتی ہے، سوشیلا اس طرح جھجکی اور ہٹی جیسے چوہا بلی کے سامنے سے بھاگنے اور بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اندرا چشم مجبور سے تماشا دیکھ رہی تھی، اس پر بیہوشی کا دورہ پڑا اور وہ وہیں بیہوش ہو گئی۔

مہاراجہ صاحب اپنے کارِ خیر میں مصروف رہے اُن کے سامنے سوشیلا کی بساط ہی کیا تھی؟ آدھے گھنٹے کے بعد، اندرا ہوش میں آئی، تو اُسنے سوشیلا کے پھٹے ہوئے لباس، روتی ہوئی آنکھوں، چوُر چوُر جسم اور سسکتی ہوئی آہوں سے سب کچھ سمجھ لیا، جو کسر رہ گئی تھی وہ مہاراجہ کے فاتحانہ تبسم نے پوری کر دی۔

مہاراجہ نے پھر تالی بجائی، وہ جوان پھر حاضر ہوئے ایک کی طرف اشارہ کر کے کہا، سوشیلا کو خاص محل میں لیجاؤ، اور اندرا کو بھی وہیں رکھو، ان دونوں پر کڑی نگرانی کی ضرورت ہے، یہ دونوں بڑی غیرتمند ہیں، اگر ان میں سے کوئی خودکشی کرنے میں کامیاب ہو گئی تو تم سب کی جان کی خیر نہیں، اور ہاں دیکھنا، بغیر میری اجازت کے ان دونوں سے کوئی ملنے بھی نہ پائے۔

خوسام نے ادب سے گردن جھکالی کہ ایک ایک حرف کی تعمیل ہوگی، اور مہاراجہ صاحب خراماں خراماں جہاں سے آئے تھے وہاں چلے گئے۔

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

باب

(۲۱)

عورت کا انتقام

گلشنِ حیات میں عورت ایک نرم، نازک، اور لطیف پھول ہے جس سے مشامِ جان معطر ہوتا ہے، جس سے رُوح سکون پاتی ہے، جس سے دِل کی دُنیا آباد رہتی ہے، عورت ہمہ تن سپردگی ہوتی ہے، وہ ایک بار جس کی ہو جائے زندگی بھر اسی کا کلمہ پڑھتی ہے، وہ بار بار محبت نہیں کرتی، وہ محبت کا جام صرف ایک مرتبہ پیتی ہے، اور زندگی بھر اسی میں مدہوش رہتی ہے

وہ ان قدح خواروں کی طرح نہیں پیتی، جو جام کے جام خالی کر دیتے ہیں مگر جن کی تشنگی باقی رہتی ہے۔

عورت ظلم سہہ لیتی ہے، تکلیف برداشت کر لیتی ہے، فاقے کر لیتی ہے مگر اپنی وفا پر آنچ نہیں آنے دیتی، لیکن اسی وقت تک جب تک اُسے نفرت نہ ہو، جو عورت کسی سے نفرت کرتی ہو، وہ پھولوں کی سیج کو بھی کانٹوں کا بستر سمجھتی ہے، وہ سیم وزر کے انبار کو کنکر پتھر سے زیادہ ہیچ سمجھتی ہے، وہ عالی شان محلوں کو خس پوش جھونپڑوں سے بدتر سمجھتی ہے۔

اور اگر کہیں عورت انتقام پر تیار ہو جائے تو اس سے بڑھ کر خوفناک کوئی نہیں، پھر وہ شیرنی سے زیادہ خونخوار اور ناگن سے زیادہ زہریلی بن جاتی ہے، پھر وہ نہ تحریص و ترغیب سے متاثر ہوتی ہے، نہ تہدید اور ہیبت سے اسکے عزائم میں تبدیلی ہوتی ہے۔

اندرا کو مہاراجہ سے نفرت ہو گئی، سوشیلا کا رواں رواں مہاراجہ سے انتقام لینے کے لئے تڑپ رہا تھا، ان دونوں ناتجربہ کاروں کو ایک تیسری رجنی مل گئی، جو بے انتہا تجربہ کار، اگرگ باراں دیدہ، اور سرد و گرم چشیدہ تھی، ایک زمانہ تھا کہ رجنی محل کی ایک معمولی داسی تھی، لیکن مہاراجہ اس پر ملتفت ہوئے اور وہ فرش سے عرش پر پہنچ گئی، لیکن اس کا یہ دورِ عروج بہت محدود تھا، جلد ہی مہاراجہ کی تنوع پسند طبیعت اس

سے اُکتا گئی، اور وہ باغ حسن کے تازہ بتازہ نو بنو پھولوں سے اپنا دامن بھرنے لگے ۔ رجنی اب اترا ہوا، رات بھر کا مسلا ہوا، مرجھایا ہوا ہار تھی، اس کی جگہ اب گردن نہیں تھی، خاک کا ڈھیر تھا، وہ اپنی جگہ پہنچ گئی ۔

ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ زوال کے بعد عروج جتنا خوشگوار ہوتا ہے عروج کے بعد زوال اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہوتا ہے ۔ رجنی جب تک رجنی تھی اُسے اپنی حالت پر کوئی ملال نہیں تھا بلکہ وہ اسپر قانع تھی، لیکن کچھ عرصہ تک، عیش و تنعم کی لذت حاصل کر لینے کے بعد، پھر وہی رجنی بن جانا اس کے لئے کسی طرح بھی قابلِ برداشت نہیں تھا۔ مہاراجہ کے ہاتھ میں سب کچھ تھا، انہوں نے اُسے جب جو چاہا بنا دیا اور وہ بن بھی گئی لیکن اس کے دل میں جو تلخی، جو نفرت، جو ہوس انتقام پیدا ہو چکی تھی، وہ نہ مہاراجہ کے انعام و اکرام کی بارش سے دھل سکتی تھی، نہ اُن کی سرپرستی اور بندہ نوازی اُسے محو کر سکتی تھی ۔

وہ بندہ مجبور تھی، اسلئے اگرچہ اس کے دلمیں نفرت، حقارت اور انتقام کا جوالا مکھی پھٹا پڑ رہا تھا، لیکن وہ خاموش تھی، بے بس آدمی اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے ؛ اب جو اُسے محل میں اندرا اور سوشیلا کی نگہبانی سونپی گئی تو اس کو دو رفیق درد اور مل گئے، جو بخار اس کے دلمیں بھرا ہوا تھا، اس کے نکلنے کا موقع ملنے لگا ۔

شروع شروع میں تو اندرا اور سوشیلا نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ان کی "داروغۂ دوزخ" ہے، کچھ زیادہ توجہ نہیں کی، رسی جل جاتی ہے تب بھی اس کا بل نہیں نکلتا، مہارانی اور راجکماری کا ایک معمولی داسی سے میل ہی کیا، یہ بات بھی تھی کہ ان دونوں کو زندگی سے زیادہ موت سے دلچسپی تھی۔ جس ماں کے سامنے اس کی بیٹی کی آبروریزی اس کا شوہر کرے، جس لڑکی کو اپنی ہوس رانی کا تختۂ مشق وہ بنائے جو اسکی ماں کا خاوند ہو، اس کے لئے زندگی میں کیا کشش ہو سکتی ہے؛ یہ دونوں اس کے لئے تیار نہیں کہ رجنی جتنا زیادہ ظلم کر سکتی ہے کر لے، جتنا زیادہ ستا سکتی ہے ستا لے اس کا بڑے سے بڑا ظلم بھی مہاراجہ کے ظلم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لیکن اندیشہ کے بالکل برعکس انہوں نے دیکھا تو یہ کہ رجنی انہیں تکلیف پہنچانے کے بجائے ان کی راحت و آسائش کا خیال رکھتی ہے، ان کے دکھ اور درد پر کڑھتی ہے، ان کی بے بسی اور مجبوری پر خون کے آنسو بہاتی ہے، مہاراجہ کا ذکر آجائے تو وہ ایک ایک منہ میں سو سو گالیاں دیتی ہے، اس طرز عمل کا جو نفسیاتی اثر ہونا چاہیئے تھا وہ ہوا اور اندرا اور سوشیلا نے اس سے بات چیت شروع کر دی، اسے "اپنا" آدمی سمجھنے لگیں

ایک روز اندرا نے بڑے رازدارانہ انداز میں رجنی سے کہا،

"کیا تم مجھے تھوڑا سا زہر لا کے دے سکتی ہو؟"

"ہاں دے سکتی ہوں مگر تمہارے لئے نہیں"

"پھر کس کے لئے؟"

"مہاراجہ کے لئے"

"ایں؟"

"ہاں مہاراجہ کے لئے، اس پاپی اور ملیچھ کے لئے جس نے نہ جانے کتنی سہاگنوں کو بیوہ اور کتنی کنواریوں کو بے آبرو کر دیا"

"تم بھی اس کے لچھن جانتی ہو؟"

"تم سے زیادہ"

"ہمیں تو زہر چاہیئے اپنے لئے" سوشیلا نے کہا۔

"کیوں چاہیئے؟ تم نے کیا خطا کی ہے جو جان دیئے دیتی ہو؟ اچھی بات کہی، بے گناہ لوگ زہر کھا کے مریں، اور گنہگار جگ جگ جئیں، نا بابا مجھ سے یہ پاپ نہیں ہونے کا، میں تو تمہیں زہر نہیں دے سکتی لاکر"

"نہ دو، مرنے والوں کو کوئی روک نہیں سکتا"

"آخر تم مرنا کیوں چاہتی ہو؟"

"رجنی تو دیکھتی ہے، وہ پاپی روز مسکراتا ہوا میرے کمرہ کے سامنے سے گذرتا ہے، پھر میری لڑکی کے کمرہ میں رات بھر پاپ کی زندگی بسر کرتا ہے، اور پھر ہنستا ہوا کھلکھلاتا ہوا، گویا میرا مذاق اڑاتا ہوا

نکلتا ہے اور چلا جاتا ہے! اندرا نے کہا

"تو؟"

"مجھ سے پوچھتی ہو تو؛ تو میری جگہ تم ہوتی تو کیا کرتی؟"

"بتاؤں کیا کرتی؟"

"ہاں بتاؤ"

"میں یہ کرتی کہ سوشیلا کو سکھا پڑھا کر مجبور کرتی کہ وہ تریا چرتر دکھائے، مہاراجہ کو ناز و نخرہ سے اپنا بنا لے یہاں تک کہ وہ اس کے قبضہ میں آجائیں اور پھر کسی موقع سے شراب میں زہر دے کر اُن کا خاتمہ کر دے"

"اس سے ہمارے مُنہ کی سیاہی کیسے دھلے گی؟"

"دُھل جائے گی"

"کیسے؛ بتاؤ نا!"

"تمہارے منہ پر سیاہی ہے کب؛ سیاہی ہے مہاراجہ کے مُنہ پر، دل پر، آنکھ پر"

اندرا نے کہا -

"لیکن یہ کام ہے جوکھم کا"

"جوکھم کی کیا پروا!"

"یہ کیوں؟"

"اب بھی مرنا، جب بھی مرنا، مرنے والے کو جوکھم کا کیا دھیان!"

"تو تیری رائے یہ ہے؟"

"اپنی رائے تو یہی ہے!"

اس گفتگو کے بعد، نہ معلوم کس طرح سوشیلا کے طرزِ عمل میں تغیر پیدا ہو گیا، مہاراجہ اب تک اُس پر قابض تھے، لیکن اسی طرح جیسے ایک منہ زور گھوڑے پر اناڑی سوار ہوتا ہے، وہ جب بھی اس کے پاس جاتے تھے محسوس کرتے تھے کہ اس کا رواں رواں ان سے نفرت کرتا ہے، وہ اُن سے بات بھی نہیں کرتی تھی، حقارت بھری نظروں سے انہیں دیکھتی تھی، ان کے التفات کا جواب آہوں اور سسکیوں سے دیتی تھی، پھر بھی تھے وہ اتنے دھن کے پکے کہ اپنے کام میں لگے رہتے تھے، اس سے دستبردار ہونے کا نام بھی نہیں لیتے تھے لیکن ہر ہر سکنڈ وہ یہ اندازہ کرتے تھے کہ یہ سودا ہے زبردستی کا، لیکن اب؟

اب سوشیلا ان کا سواگت کرتی تھی، ان کے آنے سے پہلے بن سنور کر بیٹھ جاتی تھی، ان کی طرف مسکرا کے دیکھتی تھی ان کی آرزوؤں اور تمنّاؤں کا خیر مقدم کرتی تھی، بلکہ خود انہیں دعوتِ التفات دیتی تھی۔

یہ معمولی تبدیلی نہیں تھی، مہاراجہ اس تغیرِ احوال سے بے انتہا مسرور

RAJA LIBRARY.
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.

تھے، انہوں نے ایک روز پوچھا،

"سوشیلا تم بدل کیوں گئیں ؟"

"کیا مطلب ؟"

"پہلے تو تم اتنی کھنچی کھنچی رہتی تھیں اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت شروع ہو گئی ہے !"

"محبت کسی سبب کی پابند نہیں ہوتی "

"کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو ؟"

"آپ نے کیا رائے قائم کی ہے ؟"

"اسی کی تو تصدیق کرنا چاہتا ہوں "

"میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے غلط رائے نہیں قائم کی ہے ؟"

"واقعی ؟"

"اب اس سے زیادہ آپ مجھ سے اور کیا کہلوانا چاہتے ہیں ؟ بہر حال عورت ہوں حد سے زیادہ بے شرم تو نہیں ہو سکتی "

"میں سب کچھ سمجھ گیا، سوشیلا اب تم کچھ نہ کہو "

"لیکن ایک بات ضرور کہوں گی ؟"

"کہو کہو"

"یہ آپ نے چوکی پہرہ جو میرے اوپر بٹھا رکھا ہے اسے ذرا اور

اور سخت کر دیجئے۔"

"یعنی"

"نگرانوں میں چند آدمیوں کا اضافہ اور کر دیجئے۔"

"یہ کیوں؟"

"اسلئے کہ میں اگر بھاگوں گی تو ان کے روکے نہیں رکوں گی، مجھے روکنے کے لئے ایک پوری فوج چاہیئے!"

"(مسکرا کر) فوج؟"

"ہاں مسلح فوج، جس کے ساتھ ٹینک بھی ہوں، بم بھی ہوں، ہر قسم کا سامان جنگ ہو۔"

"بڑی چوٹ کر گئیں تم!"

"اگر کوئی بات ناگوار ہوئی تو میں معافی چاہتی ہوں"

"سوشیلا مجھے زیادہ شرمندہ نہ کرو"۔

"ارے آپ شرمندہ ہو رہے ہیں"

شرم چہ کتی است کہ پیش مرداں بیاید!

"سوشیلا!"

"فرمائیے!"

"مجھے معاف کر دو"

"(مسکرا کر) نہیں معاف کرتے ہم، کیا کرلیں گے آپ ہمارا!"

"سر رکھ دوں گا اپنا تمہارے قدموں پر"

"میں اسے ٹھکرا دوں گی"

"اس سے زیادہ اور مجھے چاہیئے کیا؟"

"شعر تو بڑا اچھا کہہ لیتے ہیں آپ"

"اب بنانے لگیں تم؟"

"اچھا میں معافی مانگتی ہوں، معاف کر دیا آپ نے؟"

(مسکرا کر) نہیں معاف کرتے ہم، کیا کرلو گی تم ہمارا،

"سر رکھ دوں گی اپنا آپ کے قدموں پر"

"میں اسے ٹھکرا دوں گا"

"اس سے زیادہ اور مجھے چاہیئے کیا؟"

"خوب شعر کہا تم نے!"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے، رجنی اسوقت اندر آکے کمرہ میں بیٹھی اس سے کچھ باتیں کر رہی تھی، قہقہہ کی.... مشترک قہقہہ کی.... آواز کمرہ میں بھی آئی، رجنی نے عارفانہ انداز میں گردن ہلائی، اندر آ مسکرا دی، لیکن بڑی تلخی تھی اس مسکراہٹ میں!

جوں جوں مہاراجہ اور سوشیلا کے تعلقات خوشگوار ہوتے گئے

ویسے ویسے، پہرہ ہٹتا گیا، نگرانی کم ہوتی گئی، پابندیاں دُور ہوتی گئیں۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہوگئی کہ سوشیلا، مہاراجہ پر حکومت کرنے لگی۔ جب مہاراجہ نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تو کس کی مجال تھی کہ اس سے سرتابی کرتا، کس میں ہمت تھی کہ اس کے فرمان کی تعمیل سے انکار کرتا، وہ مہاراجہ کی منظورِ نظر جو تھی!

اندرا دیکھ رہی تھی کہ سوشیلا پر عجب مجنونانہ دھن سوار ہے، اس کا آہنی عزم، اسکی ہر ہر بات سے جھلکتا تھا، وہ خود بھی مہاراجہ سے نفرت کرتی تھی، لیکن سوشیلا کے تیور دیکھ کر وہ دہل اُٹھتی تھی، نہ جانے کیوں اُس کا دل دھڑکنے لگتا تھا، اس کے بدن بھر میں سنسنی سی دوڑ جاتی تھی، اُسے سوشیلا کے چہرہ پر مُردنی سی چھائی ہوئی دکھائی دینے لگتی تھی، وہ اس دنیا میں سب کچھ برداشت کرسکتی تھی، لیکن نہیں برداشت کرسکتی تھی تو سوشیلا کی موت!

ایک روز اُس نے موقع پاکر سوشیلا سے کہا،

"بیٹی، یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

"کیا ہوگیا ہے مجھے؟"

"جو کچھ تمہیں ہوگیا ہے، میں تمہارے چہرہ پر پڑھ رہی ہوں اُسے"

"پھر آپ مجھ سے پوچھتی کیوں ہیں؟"

" ماں جو ہوں، ممتا جو ہے!"

"تو میری ہمت بڑھایئے، مجھ میں حوصلہ اور اُمنگ، جذبہ اور جوش پیدا کیجیے۔"

"بیٹی میں اپنا فرض پہچانتی ہوں، اسے میں خود ادا کروں گی۔"

"اور میں بیٹھی مُنہ دیکھتی رہوں؟ اولاد کا فرض ہے کہ ماں کا کام خود انجام دے، ماں کب تک اولاد کے لئے دُکھ جھیلتی رہے گی۔"

"تیری ان باتوں میں مجھے موت جھلکتی دکھائی دیتی ہے!"

"تو تم موت سے ڈرتی ہو؟"

"ہرگز نہیں"

"پھر مجھے کیوں ڈراتی ہو"

"تیرے ابھی مرنے کے دن نہیں ہیں"

"تو میں مر کب رہی ہوں؟"

"پھر میں تو امر ہونے کی تیاریاں کر رہی ہوں"

"کیا کہا تو نے؟"

"میں اس پاپی کو مار کر ضرور مروں گی لیکن زندہ جاوید بن جاؤں گی دُنیا دیکھ لے گی، عورت کی کمزور انگلیاں جب انتقام کا پھندا بنتی ہیں تو ان میں کتنی شکتی، کتنی طاقت آجاتی ہے!"

"تو نے ابھی دُنیا میں دیکھا ہی کیا ہے سوشیل!"

"جو کچھ دیکھ چکی ہوں اس کے بعد کچھ دیکھنے کی ہوس بھی نہیں باقی رہی ماں!"

اندرا رونے لگی، رجنی بیٹھی ہوئی یہ باتیں سن رہی تھی۔ اسکی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، خود سوشیلا کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں، لیکن اُسنے آنسوؤں کو پلکوں کے شکنجہ میں کس لیا، گرنے نہیں دیا، اور بڑے وقار کے ساتھ کمرہ کے باہر آ گئی۔

رات کو حسبِ معمول مہاراجہ آئے، اور سوشیلا کے کمرہ میں چلے گئے۔ اب وہ بار بار آنے لگے تھے۔ اب اُنہوں نے پہرہ اُٹھا لیا تھا۔ اب ان مجرموں کی نگرانی بالکل ختم ہو چکی تھی،

رات کو بڑی دیر تک شغل شراب ہوتا رہا، سوشیلا ساقی دریا دل بنی ہوئی تھی، وہ جام پر جام پلا رہی تھی، اور مہاراجہ رندے آشام بنے ہوئے غٹاغٹ پی رہے تھے، وہ اس وقت بے حجاب تھی، اور مہاراجہ بے تکلف،

آخر مہاراجہ اتنے مدہوش ہوئے کہ بیہوش ہو گئے، سوشیلا نے کمرہ کا دروازہ بند کیا، رجنی کی مدد سے اُسنے مٹی کے تیل کا ایک پورا پیپا شام ہی کو منگا لیا تھا، اطمینان سے اس نے اس تیل کا غسل مہاراجہ

کو دیا، پھر کمرہ کی ہر چیز پر اسکی بارش کی، پھر اس نے اپنے جسم نازک پر ایک پوری بوتل انڈیل لی، ماچس جلائی جس طرح مُردے کی چِتا میں آگ لگاتے ہیں، اس طرح اُس نے مہاراجہ کے جسم مبارک میں آگ لگائی، پھر کمرہ کے صوفوں، کرسیوں چارپائیوں کو اس نے ماچس دکھائی، سب سے آخر میں، ایک شعلہ اُسنے اپنی تر بتر ساڑھی میں منتقل کر لیا، مہاراجہ جل رہے تھے، کمرہ کی ہر چیز جل رہی تھی، سوشیلا کے بدن سے، صرف بدن سے ہی نہیں رُوح سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔

اس وحشتناک منظر نے مہاراجہ کا نشہ ہرن کر دیا، خود شیلا کے منہ سے بھی چیخیں نکلنے لگیں، لیکن دروازہ بند تھا، آگ اپنا کام کر رہی تھی، چیخوں کی آواز کمرہ سے باہر نکلی، خدام ادب دوڑ پڑے، دروازہ بند تھا توڑا گیا، اُسے توڑ کر ملازمان دردولت کا فائر بریگیڈ" جب اندر پہنچا، تو شعلے چھت سے باتیں کر رہے تھے، کسی میں یہ ہمت نہیں تھی کہ اندر گھس جائے اور مہاراجہ یا سوشیلا کو باہر نکالا جائے،

فوراً آگ بجھانے کا کام شروع ہو گیا، آگ جب قابو میں آئی تو مہاراجہ ایک طرف جُھلسے ہوئے پڑے تھے اور سوشیلا دوسری طرف انگارہ کی طرح دہک رہی تھی،

تماشائیوں کی صف میں اندرا اور رجنی بھی تھیں، اندرا لپکی سوشیلا

کے جلتے ہوئے جسم پر گری، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ۔

رجنی نے زور زور سے ہنسنا شروع کیا، محل میں کہرام مچا تھا، حکام اور وزراء دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، لیکن رجنی بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ لوگوں نے اُسے ڈانٹا، مارا، لیکن

ع بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

رجنی کی بیساختہ ہنسی بدستور جاری تھی ۔

لوگ کہتے تھے، رجنی پاگل ہو گئی ہے، رجنی کے خوفناک قہقہے اس خیال کی تصدیق کرتے تھے ۔

RAJA LIBRARY
Tannery Road,
BIHAR COLONY, KARACHI.